من راجہ ہے

علی رضا احمد

مزاجِ راہ

علی رضا احمد

القمر انٹرپرائزز
رحمٰن مارکیٹ
غزنی سٹریٹ
اُردو بازار ○ لاہور

ISBN: 978-969-8980-67-2

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

مطبع : عرفان افضل پرنٹرز، لاہور

قیمت : 300 روپے

اِنتساب

.....اُن خوبصورت

.....جوڑوں

.....کے نام جن.....کا

.....درد

کا رشتہ قائم ہے۔

مزید تاکید	82	''وٹہ سٹہ''	84
''بصیرت''	86	سیاسی لیاقت	88
سلیج اور مزاح	90	ہیلری کے حیلے	92
اُمید	93	جھوٹے	96
چھٹکارہ کیسے!	98	کانوں کا صفایا	100
''پیار سے مار''	102	ہل چل	104
''کیچڑ اچھالنا''	106	اسامہ، اوباما اور ہنگامہ	108
سیل سیل سیل	110	''سفید'' امداد	112
تفریح	114	''چاقو چوبند''	116
''چاقو چوبند''۔۲	118	بندر، برگد اور بچن	120
''Shoe جات''	123	''Shoe جات''	125
بزدل شاہ دلیروی	127	بزدل شاہ دلیروی	129
''طبعی'' مشورے	131	ایک اور جملہ.....!	133
کھرا سیاست دان	135	''پچکے گال''	138
اقوال شیریں	141		

حرفِ آغاز

مزاح نگاری ـــــ کو ہمیشہ ایک مشکل کام سمجھا جاتا رہا ہے حالانکہ ـــــ نقش نگاری کون سا آسان کام ہے ـــــ اگر کسی مزاح نگار کو نقش نگاری پہ لگا دیا جائے تو اُس کا آنگن نقش نگار کے برش کی طرح ٹیڑھا ہو سکتا ہے ـــــ جسے نگار خانے کی توتی بھی سیدھا نہیں کر سکتی لیکن طنز کی قلم اٹھانے والے پر ٹیڑھے آنگن والا ''گُن'' اٹھانے میں بھی تامل محسوس نہیں کرتا لہٰذا اپنی آنکھ بچا کر منتخب کالموں کا مجموعہ ترتیب دے دیا ہے اور اُمید ہے قارئین کو یہ ایک آنکھ ضرور بھائے گا۔ بشرطِ آنکھ بھر کر دیکھنے کا وقت مل پائے تو ـــــ جیسے ڈاکٹر ایلی کانز کے کلینک میں کسی نے آنکھ بھر کر دیکھا تو یہ لکھا پایا:

''خبردار! مزاح آپ کی پریشانیوں میں رکاوٹ بن سکتا ہے'' ـــــ لہٰذا آپ کے مطالعہ میں مزید رکاوٹ ڈال کر پریشانیوں.....

علی رضا احمد

درد..... بے دردی

برصغیر کا کوئی شاعر ایسا نہیں گزرا جس کے کلام کو "درد" کی شکایت نہ ہوئی ہو یا وہ بغیر کسی درد کے اس جہاں سے گزرا ہو، بشرطیکہ وہ پوری شعری صفات رکھتا ہو۔ مرد شاعر کیلئے کسی "محرومی" کا درد نیک شگون قرار دیا جاتا ہے لہٰذا وہ جتنا درد محسوس کرے گا غزل اتنی ہی "شفایاب" ہوگی اور اگر کسی شاعر کا شعر درد بھرا نہ ہو تو نقاد کو شکایت ہو جاتی ہے کہ یہ کیسا شاعر ہے جسے درد سے بھی واقفیت نہیں اور غزل کے ایک آدھ مصرعے میں درد کا نہ ہونا کسی بڑے شاعر کے دردمندانہ "فیض" سے محرومی کا تاثر دیتا ہے۔ اگر نقاد ایم بی بی ایس کی ڈگری کا حامل بھی ہو تو شاعر کے کسی نہ کسی شعر کی ٹانگ بھی ٹوٹ سکتی ہے اور وہ اپنا وزن برقرار رکھنے سے قاصر ہو جاتا ہے کیونکہ شعر میں توازیہ بھولنا مشکل ہوتا ہے، چنانچہ ایک نہ ایک مصرعے میں درد پیدا کر کے پوری کتاب سے ٹیسیں اٹھا دی جاتی ہیں۔ شاید اسی لئے ہمارے ایک زیرک اور استاد شاعر نے تو اپنا تخلص "دردؔ" رکھ لیا۔ ویسے عام لوگوں کی کوشش ہوتی ہے کہ درد وغیرہ ان کے قریب بھی پہنچنے نہ پائے بھلے انہوں نے گاجروں کی فصل اڑالی ہو۔ آپ اس بات سے اندازہ کر لیں کہ خواجہ میر دردؔ کو دیکھتے ہی لوگ ایک دوسرے کو دبانے لگتے ہونگے۔ پنجابی دیہاتیکی میں درد کو پیڑ اور انگریزی میں Pain کہتے ہیں درد کو جو مرضی کہہ لیں مگر اس کی دوا ایک ہی ہوتی ہے لیکن ہر زبان کے شاعر کے درد کا علاج مختلف ضرور ہوتا ہے۔ ڈاکٹر چاہے پی ایچ ڈی ہو یا ایم بی بی ایس سب اس ضرب المثل پر متفق ہیں کہ No pain no gain۔

کئی ڈاکٹر درد دل رکھنے والے ہوتے ہیں۔ ایک مریض نے ڈاکٹر سے پریشانی کے عالم میں پوچھا ڈاکٹر صاحب کیا واقعی مجھے درد کولیج (اپنڈیکس) ہی ہے میں نے سنا ہے ایک ٹائیفائڈ کا مریض آپ کے پاس آیا تھا اور وہ ہارٹ اٹیک سے مر گیا تھا۔ ڈاکٹر بولا، میرے خلاف یہ من گھڑت قصہ پھیلایا گیا ہے حالانکہ میرے پاس جس بیماری میں بھی مریض آتا ہے اسی سے مرتا ہے۔

شاعر کا درد بھرا کلام بالآخر سفر کرتا ہوا براستہ موسیقار..... گلوکاروں تک اور گلوکاروں سے

موسیقی کے شوقینوں تک جا پہنچتا ہے اور پھر ... دل دیا درد لیا ... درد کتا نہیں ایک پل بھی..... درد منت کش دوا نہ ہوا..... درد دل، درد جگر ہم کو لگایا آپ نے اور کیسے جئیں گے درد کے مارے تیرے بغیر..... اسی طرح درد کو کبھی زبان مل بھی جاتی ہے اور کبھی درد چلنے پھرنے لگ جاتا ہے اور محسوس ہوتا ہے کہ یہ کوئی آوارہ گرد جوان ہے چنانچہ درد کیلئے Pain Killer کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں۔ آوارہ گرد درد کیلئے شاید دل میں گھسنا اس لئے نسبتاً آسان ہوتا ہے کہ دل کا دروازہ ہر وقت کھلا رکھا جاتا ہے اس لئے پہلا داؤ لگتے ہی اس کا دار شروع ہو جاتا ہے مگر بے دردی سے کیا گیا علاج درد میں مزید اضافے کا باعث بن جاتا ہے اور کبھی اپنا درد دوسرے کیلئے بھی دردسر بن جاتا ہے۔ کوئی جتنا مرضی نو دولتیا ہو اسے دردسر مول لینے سے پہلے ایک دفعہ شاعر کے انداز میں ضرور سوچنا چاہئے۔ مگر یہ سب من گھڑت باتیں ہیں کہ ملنے جلنے یا کام کی تھکاوٹ سے درد شروع ہو گیا ہے ورنہ سارا دن بولنے والا بھی یہ شکایت نہیں کرتا کہ اس کی زبان دکھ رہی ہے البتہ زبان کو ہمسائے میں دانتوں نے گھیر رکھا ہے جن میں ایسا درد اٹھتا ہے کہ زبان بھی ''گھٹنے ٹیک'' دیتی ہے اور علاج دنداں سے اخراج دنداں تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔ ایک معمر شخص ڈاکٹر سے دانت نکلوانے کے دام دریافت کر رہا تھا ڈاکٹر نے دو ہزار کا تقاضا کیا۔ بوڑھے نے کہا پانچ منٹ کام کے دو ہزار۔ ڈاکٹر نے کہا، آپ حکم کریں میں دو گھنٹے لگا کر تسلی بخش کام کئے دیتا ہوں۔ ہمارے ہاں دردِ دل رکھنے والوں کی بہت کمی محسوس کی جا رہی ہے ورنہ ہمارے معاشی حالات اس نہج تک نہ پہنچتے۔ درد عام طور پر شہریوں کو ہوتا ہے اگر یہ ارباب اختیار کو ہو تو شہریوں کو بہت افاقہ رہے۔ علامہ اقبال علیہ رحمتہ کے اس شعر سے اندازہ لگائیں کہ ؎

مبتلائے درد کوئی عضو ہو، روتی ہے آنکھ
کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ

☆.....☆.....☆

مزاح کاری

مزاح کی بے شمار شگفتہ قسمیں ہیں جس سے قلب تسکین پاتے ہیں۔ مزاح اداکاری سے کیا جاتا ہے اور صداکاری سے بھی، شاعری سے ہو جاتا ہے اور قلمکاری سے بھی اور حیرانی کی بات یہ ہے کہ گلوکاری سے پیدا کیے گئے مزاح سے دوسرے کو ''سُر'' آ جاتی ہے۔ ایک اداکار اور کارٹونسٹ کے کام کو اگر بغور دیکھا جائے تو فرق فقط یہی سامنے آتا ہے کہ اداکار کو کردار اپنے اوپر طاری کرنا پڑتا ہے جبکہ کارٹونسٹ کے لیے ایسی اداکاری مہنگی پڑ سکتی ہے۔ قلم سے تخلیق کیے گئے پہلے پولیٹیکل کارٹون کے بارے میں اگر دیکھا جائے تو یہ ۱۹۰۷ء کے ایک مغربی اخبار میں چھپا تھا اور یہ ایک ایسا فن ہے جس کے ذریعے اپنا پیغام اس جگہ پہنچایا جا سکتا ہے جہاں خط بھی نہیں پہنچ پاتا۔ جیسے خبر کے لیے وقت اہم ہوتا ہے اسی طرح اخبار کے لیے کارٹون اور کارٹون کے لیے کارٹونسٹ..... نہ کہ خبر۔ اس فن میں مہارت اس لحاظ سے ضروری ہے کہ صرف مونچھیں بنانے سے چوہا نہیں بن جاتا۔ اگر وزیر داخلہ کا کارٹون وزیر خارجہ اور وزیر خارجہ کا کارٹون وزیر خزانہ کا تاثر پیش کرے تو مزا کرکرا بلکہ سیاسی ہو جاتا ہے۔ زیادہ تر کارٹونسٹ اگر کسی اداکار کی طرح اپنے اوپر شیر کی سی بہادری طاری کریں تو وہ محض پلے تک ہی پہنچ پاتے ہیں اور اوبامہ کے کارٹون کی بجائے ''کارٹونڈ الیسارائس'' کا ہی بنا پاتے ہیں بالآخر یہ کارٹونسٹ ایڈیٹر کے دفتر سے ''دعائیں'' لینے کے بعد اپنے کارٹون کو سر پر سوار فرما کر رخصت ہو رہے ہوتے ہیں مگر جاوید اقبال اس عہد کے وہ عظیم کارٹونسٹ ہیں جن کے ہاتھ سے بنا کیری کیچر یہ تاثر بھی دے دیتا ہے کہ اسے نہائے کتنے دن ہو گئے ہیں، بابر اعوان سے وزارت چھنے کتنے ماہ بیت چکے ہیں اور کسی منجھے ہوئے موسیقار کا چہرہ کیا ''بجا'' رہا ہے یا اس مزدور کی تنخواہ اور طالب علم کو لیپ ٹاپ ملا ہے یا نہیں۔ یہ اپنے کام میں نئے تجربات بھی کرتے رہتے ہیں۔ کسی مغرور کا کارٹون بناتے ہوئے سیاہی میں مقوی معجون شامل کر کے زیادہ مشقت سے بچ رہتے ہیں۔ کسی بھائتے چور کا نقشہ کھینچتے ہوئے اس میں پولیو کے قطرے بھی شامل کر لیتے ہیں بالآخر اپنے ہر کارٹون کو تاریخ میں محفوظ رکھنے کے لیے آہنی ڈھکنے سے ڈھانپ دیتے ہیں۔ علامہ اقبال کی

طرح سیالکوٹ سے طلوع ہونے والا یہ درخشندہ ستارہ اب لاہور ہی کو مسکن بنائے ہوئے ہے۔ خدا ہر کسی کو ایسی اولاد سے نوازے جو والدین کا نام روشن کرتی ہے اور اولاد بھی ایسی جو ''انرجی سیور'' ہو، نہ صرف سیلف میڈ ہو بلکہ سیلف سٹارٹ بھی ہو۔ جاوید اقبال بچپن ہی سے بڑے ذہین طالب علم رہے۔ ایک دن دفتر سے وظیفہ کے امتحان کے بارے معلوم کرنے گئے تو آگے سے کلرک نے وظیفہ کرنے کا بھی درس دے دیا۔ ہمارے یہ معروف کارٹونسٹ ہمارا وہ سرمایہ ہیں جن سے سرمایہ دار بھی قرض چکانے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ ان کی کوشش ہوتی ہے کہ کسی کی پگڑی نہ اچھالی جائے لیکن وگ کی اتنی پرواہ نہیں کرتے کیونکہ وگ لگا کر بھی کوئی پگ نہیں پہنتا۔ ایسے بااصول انسان ہیں کہ شیروانی پوش کی گیدڑ بھبھکی پر کان نہیں دھرتے۔ ان کے آرٹ کی پرواز بہت اونچی ہے لیکن یہ ساؤنڈ بیریئر کراس کرتے ہوئے کبھی عار محسوس نہیں کرتے۔ بینجمن کے کلیے Never complain and never explain کے مطابق قلم چلاتے ہیں۔ ایک دن استفسار پر بتایا کہ کئی لوگ بڑے خطرناک ہوتے ہیں ان سے تو اپنے کتے کی ٹانگ بھی بچانی چاہیے۔

ستاروں پر اتنا یقین نہیں رکھتے جتنا فلمی ستاروں پر رکھتے ہیں اور نجومیوں کے حسابات کو بھی سیاسی تناظر میں دیکھتے ہیں اگر زائچہ ٹھیک نہ دکھائی دے تو ٹیرو کارڈ سے حساب لگوا کر اعتماد حاصل کر لیتے ہیں اور اپنی کامیابی کا راستہ دیکھ لیتے ہیں اسی تکنیک میں تجربے کی بدولت اور ان کے ماتھے پر کامیابی لکھی ہے۔ اب عمر کے اس حصے میں پہنچ چکے ہیں جسے جوانی کہتے ہیں اسی لیے کسی سخت موسم میں بھی بہاروں کا مزہ لے رہے ہوتے ہیں۔ اپنی صحت کا خاص خیال رکھتے ہیں اور کیوں نہ رکھیں اپنی صحت کے بارے میں تحفظات ہی ان کے راز صحت ہیں۔ اپنی ۳۲ میگا پکسل جوانی اور آنکھوں کی رونق کو قائم رکھنے کے لیے گاہے بگاہے ڈاکٹر کو دکھانا ہوتا ہے اور ڈاکٹر کو معلوم ہی نہیں ہوتا کہ یہ بھی اسے دیکھ رہے ہیں۔ دریں اثنا اپنی حسِ لطافت پر گرفت رکھتے ہوئے الٹا اس کے علاج کی بجائے لاج رکھ رہے ہوتے ہیں۔ محترم عطاء الحق قاسمی چونکہ زمانہ شناس ہیں اس لیے وہ بھی احتیاطاً روزنِ دیوار ہی سے دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ جاوید اقبال اگر کسی کو غور سے دیکھیں تو وہ خود کو ٹام اینڈ جیری محسوس کرنے لگ جاتا ہے اور اگر کسی نے نئے پیازی کپڑے پہنے ہوں یا وہ پیاز خوری کا شوقین ہو تو وہ خود کو Pink پینتھر محسوس کرنے سے بھی نہیں چونکتا۔

منصور اعجاز کی طرح انہیں کسی کو براہ راست نان سنس نہیں کہنا پڑتا ان کی انگلیاں یہ کام

یا آسانی انجام دے دیتی ہیں اور کوئی دوسرا انگلی بھی نہیں اٹھاپاتا۔ انگلیوں کی پوروں میں کیسرے کی ایجاد ابھی کل ہی کی خبر ہے مگر یہ اپنی انگلیوں کے ہنر سے کسی کو بیمار اور صحت مند بنا دیتے ہیں کیونکہ ان کے کارٹون حقیقی زندگی کی عکاسی کرتے ہیں۔ اگر کسی موٹے شخص کا کارٹون بنا دیں تو یہ موٹاپوری اخبار پر سیر کرتا دکھائی دیتا ہے۔ اپنے پرانے دوستوں کو کبھی نہیں بھولتے سعید بودلہ، سلیم شیخ، کیپٹن افتخار بھٹی اور میجر فیصل کو ان کے گھروں سے ساتھ لے کر اپنے ڈیرے پر لے جاتے ہیں اور پھر مرغے کی ٹانگوں سے ان کے اوپر دست ''شفقت'' رکھتے ہیں پھر وہاں محترم حسن نثار اور عرفان کھوسٹ سے ملاقات بھی رہتی ہے۔

ان کی صحت کا ایک راز یہ بھی ہے کہ اکثر معروف نظر آتے ہیں قناعت پسند تو ہیں ہی مگر کنات پسند بھی واقع ہوئے ہیں۔ روزانہ تین چار شادیوں کی آفرز ان کو اس مولوی کی طرح پریشان کرتی ہیں جسے پوچھا گیا تھا کہ ببولو بھی صاحب حلوہ کھانا پسند فرمائیں گے یا قورمہ..... مگر موصوف سب کو ٹھکرا کر اس شادی میں شرکت کرتے ہیں جس دعوت میں پرہیز کی ڈش شامل ہو اور روکھی سوکھی مگر وقت پر مل جائے تو اسے فوقیت دیتے ہیں۔

اٹھارہ سال اکٹھے رہنے کے بعد ایک مغربی جوڑے نے فیصلہ کیا کہ کیوں نہ شادی کر لی جائے۔ تھوڑی دیر رنجیدہ ہونے کے بعد مردوں کو یاد ہوا ''اب اس عمر میں کون بے وقوف مجھ سے شادی کرے گا۔'' کیونکہ وہاں کا یہ ماحول ہے کہ Miss is known by the company she keeps. لیکن ہمارے ہاں ماحول بڑا مختلف ہے ایک عورت نے بچوں کے کپڑوں کا آرڈر دیا ہوا تھا کمپنی کی طرف سے اس میں دیری ہو گئی۔ اس نے یہ کہتے ہوئے آرڈر کینسل کروادیا کہ آپ کی ڈلیوری سے تو میری تیز ہے۔

☆.....☆.....☆

دانت

دانت جسم کا اہم عضو ہیں۔ دانتوں سے ڈسنے، ڈرانے اور ڈکارنے کا کام بھی لیا جاتا ہے جس کا جبڑا مضبوط ہو وہ جنگل کا بادشاہ بھی کہلاتا ہے اور ملک کا بھی کیونکہ ہمارے اکثر قابل قدر صدور کے دانت اور جبڑے بہت مضبوط پائے گئے ہیں اور ان کے جانے کے بعد ان کی پہچان کا باعث بھی بنے ہیں۔ دانتوں کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ اگر مشین کی گراری کا دندانہ ٹوٹ جائے تو وہ بیکار ہو جاتی ہے۔ چنانچہ جب صدام گرفتار ہوئے تو سب سے پہلے ان کے دانتوں ہی کا معائنہ کیا گیا..... شاعروں کے خیال میں اندھیری رات کے دانت لمبے ہوتے ہیں کیونکہ وہ بھی کاٹنے کو دوڑتی ہے۔ دانتوں کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ یہ زبان کو قید میں رکھتے ہیں۔ اب آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ کوا بولنے اور شور مچانے میں کیوں مشہور ہے۔

ایک بات یاد رکھنے کی ہے کہ.....

صحت مندی کے تین اسباق

واک (WALK) خوراک اور مسواک

دانت انسانوں اور حیوانوں کو بوڑھا ہونے سے بچانے بلکہ دشمن کے ہاتھوں موت سے بچانے کا بھی اہم ذریعہ ہیں۔ اگر کسی انسان کے منہ سے دانت جھڑنا شروع ہو جائیں تو اسے دانتوں کا کام آنتوں سے لینا پڑتا ہے اور آنتیں کتنے دن گاجر، مولیوں کو گرائنڈ کر سکتی ہیں۔ کسی درندے کے اگر دانت ٹوٹ جائیں تو وہ جلد ہی کسی اور درندے کی درندگی کا شکار ہو جاتا ہے۔

جس کے منہ میں دانت نہیں ہونگے وہ کچھ کھا نہیں سکے گا۔ اس کی خوراک کم ہوتی چلی جائے گی اور وہ کمزور ہوتا چلا جائے گا۔ بڑھاپا تو ہے ہی محسوس کرنے کی چیز، یعنی جسے دانت کی تکلیف ہوتی ہے بس وہی دانت درد کی شدت کو جانتا ہے۔ شیر جنگل کا بادشاہ صرف اس لئے کہلاتا ہے کہ اس کا جبڑا مضبوط ہوتا ہے اگر مچھیرے جسم کی بات ہوتی تو ہاتھی کے دانت دکھانے کے نہ ہوتے۔ میرے ایک فیملی ڈینٹل سرجن جناب بی ڈی ایس BDS صاحب (یعنی بدر الدین سیال صاحب) بہت پائے کے عطائی ڈینٹل سرجن ہیں اور مزید یہ کہ بہت اچھے شاعر اور ادیب بھی ہیں۔ ان کے نام کا اختصار ہی ان کیلئے ڈگری کا کام دیتا ہے۔ ان کو خود ساختہ ڈینٹل سرجن ہونے کے دو بڑے فوائد حاصل ہو چکے ہیں۔ ایک یہ کہ آئندہ بھی ان کے

دانت کٹھے نہیں ہوں گے اور دوسرا ان کے دانتوں میں کبھی درد بھی نہیں ہوگا کیونکہ انہوں نے اپنے مسوڑوں کی پلاسٹک سرجری کروالی ہے۔ یعنی اپنے منہ میں بتیسی رکھ لی۔ خاص طور پر ''ڈینٹل'' سرجن انہیں اس وقت کہا جاتا ہے جب وہ اپنے منہ سے بتیسی نکال کر مصنوعی ڈینٹ ڈال لیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے کلینک میں یہ لحہ فکریہ بورڈ لگوا رکھا ہے کہ ''دانت صاف رکھیں ورنہ مسوڑے صاف ہو جائیں گے''

جب ان کے اپنے دانت گر رہے تھے تو ان کے لب پر عالم تاب تشنہ کا یہ شعر اکثر آیا کرتا تھا کہ ؎

میرے پہلو میں وہ آیا بھی تو خوشبو کی طرح　　میں اسے جتنا سمیٹوں وہ بکھرتا جائے

ڈاکٹر صاحب کا منہ ویسے بھی بہت بڑا ہے اور یقیناً اسی حساب سے ان کی بتیسی کا سائز ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے پہلے پہل کچھ دنوں کیلئے اپنے مریض دوست سے ادھار بتیسی لے کر اپنا جبڑا چلائے رکھا تھا، پھر وہی ہوا جو چھوٹا جوتا پہننے سے ہوتا ہے۔ دوستی ہے ہی ایک دوسرے کے کام آنے کا نام۔ اسی دوستی کی وجہ سے لوگ ہاتھوں میں ہاتھ دینے کی رٹ لگاتے ہیں لیکن یہ دانتوں میں دانت دینے کی خواہش رکھتے ہیں۔ دوست سے ادھار لی گئی وہ بتیسی ذرا پرانے ماڈل کی تھی کیونکہ اس بتیسی کے کئی دانتوں کو کیڑا تک لگ چکا تھا بہرحال مانگے گھوڑے کے دانت کون گنتا ہے اس لئے ڈاکٹر صاحب نے بھی اس کی قطعی پرواہ نہ کی۔ چونکہ یہ ادبی شخصیت بھی ہیں اس لئے یہ اپنے کلینک میں نئے نئے بورڈ لگاتے رہے ہیں۔ ایک دفعہ ان کے کلینک میں یہ لکھا تھا۔

''یہاں دانتوں کی ہر بیماری کا دندان شکن جواب دیا جاتا ہے''

لوگ جیب میں ماچس نہیں رکھتے، بی ڈی ایس صاحب نے پوری بتیسی کا بیڑا اٹھایا ہوا ہے جو صبح ہوتے ہی ان کے منہ میں غرق ہونا شروع ہوتا ہے۔ اس لئے ڈاکٹر صاحب اپنے مریضوں کا کھلے دل کی بجائے کھلے منہ سے استقبال کرتے ہیں۔ مریض ان کو دیکھتے ہی آداب بجالاتے ہیں اور

یہ دانت بجالاتے ہیں،

ڈاکٹر صاحب کے دانت ان کو موسمیات کی رپورٹ فراہم کرتے رہتے ہیں سخت سردی میں بھی انہیں سردی نہیں لگتی، جبکہ مریضوں کے دانت بج رہے ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب بھی ان کا احساس کرتے ہوئے اپنی شلوار کی جیب سے مصنوعی دانت نکال کر منہ میں رکھ لیتے ہیں اور ان کو منہ میں رکھتے ہی جب یہ بتیس تال میں بجنا شروع ہوتے ہیں تو ڈاکٹر صاحب کو اطمینان ہوتا ہے کہ آج واقعی سردی ہے۔ حالانکہ موصوف ایک دندان ساز ہیں لیکن انہیں اس وقت بہت دکھ ہوتا ہے جب کوئی مریض ان کو ''آنکھیں دکھا'' جائے۔ لوگ ان کی طرف دیکھ کر اکثر مسکرا

دیتے ہیں، اس لئے انہوں نے کلینک میں یہ بورڈ لکھوا رکھا ہے کہ

''معائنے کے دوران دانت مت نکالئے''

بورڈ لکھوانے کی وجہ یہ ہے کہ مسکرانے کیلئے پہلی شرط دانت ہیں اور اگر دانت منہ میں نہ ہوں تو لوگ آپ پر مسکرا سکتے ہیں۔ ان کی خوبصورتی کے ساتھ تھوڑی سی ٹریجڈی یہ ہوئی ہے کہ ان کے ناک کے سوراخ یعنی نتھنے ذرا بڑے ہیں جن کی وجہ سے ان کا ناک بھی ہولناک نظر آتا ہے اور منہ بڑا ہونے کی وجہ سے ان کا جبڑا بھی ''الجبڑا'' محسوس ہوتا ہے۔

مریضوں کیلئے یہ اتنے اچھے اخلاق کے مالک ہیں کہ اگر یہ کسی مریض کیلئے بتیسی تیار کریں تو اسے کم از کم ایک ہفتہ اپنے منہ میں لگا کر ٹیسٹ کرتے ہیں۔ ایک دفعہ ان کے ایک مریض نے شکایت کی کہ آج کل ہپاٹائٹس بیماریاں بہت تیزی سے پھیل رہی ہیں لیکن آپ کے دانتوں کا معائنہ کرنے والے اوزار بہت گندے ہو رہے ہیں ان کی صفائی کا کوئی انتظام نہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے منہ کو فوراً غضب سے صاف کرتے ہوئے فرمایا کہ ''مجھے مہینوں سے انکی شکایت کسی نے نہیں کی اور تم بڑے آئے صفائی پسند''

جیسے نزدیک اور دور کی عینک ہوا کرتی ہے۔ اسی طرح سے اب ڈاکٹر صاحب نے اپنے لئے دو اقسام کی بہت اچھی بتیسیاں تیار کی ہیں۔ ایک بتیسی سے تو وہ صرف مسکرانے کا کام لیتے ہیں یا زیادہ سے زیادہ اس سے چائے، شربت یا کولڈ ڈرنک پینے کا..... دوسری بتیسی سے وہ گنا وغیرہ بھی چوس لیتے ہیں۔ نیچے والی بتیسی کو اوپر اور اوپر والی کو نیچے لگانا تو ان کا ''بائیں'' جبڑے کا کمال سخن ہے۔ انہیں جراثیموں کے متعلق بہت فکر رہتی ہے۔ چند لمحات کیلئے یہ منہ سے بتیسی نکال کر جب میز پر رکھتے ہیں تو اسی وقت اسے اپنی جرابوں سے ضرور ڈھانپ دیتے ہیں تاکہ اسے مکھیاں اپنے منہ میں فکس نہ کرلیں۔ ڈاکٹر ہونے کی وجہ سے کبھی ان کا ہاتھ تنگ ہوا ہے نہ بتیسی۔ انہوں نے ہاتھ میں ایک نمبر بتیسی پکڑی ہوتی ہے لوگ سمجھتے ہیں انہوں نے ہاتھ میں موبائل پکڑا ہوا ہے۔

آپ نے یہ سنا ہوگا کہ ''جب دانت تھے تو چنے نہ تھے اب چنے ہیں تو دانت نہیں'' یہ مثال شاید خاص طور پر پاکستانیوں کیلئے بنی ہے کیونکہ بدقسمتی کے ایسے نازک مرحلوں سے صرف وہی گزرتے ہیں۔ میرے ملک کے معصوم بے روزگاروں کو خود ہی اپنے ''جبڑے'' مضبوط کرنا ہونگے..... اور وہ ہیں اپنے ارادوں کے جبڑے..... جن سے موجودہ صورت حال کو باآسانی ''داڑھ تلے'' لیا جا سکتا ہے.....

☆.....☆.....☆

ڈاکٹر حکیم بخش ہومیو

اپنا نام کسے پیارا نہیں ہوتا بھلے یہ شربت خان لوفے والا ہی کیوں نہ ہو کیونکہ یہ ایک فطری سا امر ہے اگر کوئی حسین شکل آپ کا نام پکارے تو آپ کو لبلبے تک مٹھاس محسوس ہوتی ہے۔ میرے شہر کے ڈاکٹر حکیم بخش لقمانی ہومیو پتہ نہیں کیوں اپنے نام سے ''الرجک'' ہیں خصوصاً جب کوئی انہیں کلینک میں ان کے اصلی نام یعنی حکیم صاحب پکار دے۔ پھر ان کی طبیعت ان کے اپنے ''فن'' یعنی ہومیو پیتھی کی طرح ''ڈاؤن'' ہو جاتی ہے کیونکہ یہ ان کا روزگار بھی ہے اور مجبوری بھی۔ سارے شہر کو معلوم ہے کہ یہ ہومیو کے بھی عطائی ڈاکٹر ہیں۔ انہوں نے تعلیم کو مڈل ہی میں ''طلاق'' دے کر تسنیم نامی پڑھی لکھی خاتون سے شادی کر لی تھی۔ اس وقت یہ حکیم اور تسنیم کے حسین امتزاج کے طور پر ابھرے اور بعد ازاں تسنیم حکیم خطرہ جان کے طور پر بھی..... اپنے نام سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ ایلوپیتھی، ہومیو پیتھی اور یونانی طرز علاج سے اپنے مریض کی سیوا کرتے ہیں یا جیسے بھی کسی مریض پر فٹ بیٹھے اور وہ اپنی چرب زبانی سے دولت کو سمیٹنے لگے ہوئے ہیں۔ فرض کریں ان کے پاس یرقان کا مریض آ جائے تو یہ اسے باتوں باتوں میں ایسی ''یرقانوے'' لگائیں گے کہ وہ پیشنٹ اپنا سب کچھ ''Pay شنٹ'' کرنے پر تیار نظر آئے گا۔ ان کی شگفتہ مزاج تسنیم انہیں پاکر اپنی شگفتگی تک کھو بیٹھتی ہے حالانکہ یہ بے چاری حقوق نسواں کی علمبردار ہے۔ جتنے مریض ڈاکٹر حکیم بخش نے سورگ باش کئے ہیں شاید اس وجہ سے یہ حقوق چالیسواں کی بھی انڈر سیکرٹری بن جائے۔ آپ ان کی آپس میں ''انڈر سٹینڈنگ'' کا اندازہ اس بات سے کر سکتے ہیں کہ جب یہ اپنی زوجہ کے کمرے میں داخل ہوتے ہیں تو انہیں میٹل ڈیٹکٹر Matel Detector سے تلاشی دینا پڑتی ہے، اب آپ ہی بتائیں کہ ان میں شگفتہ مزاجی کی بجائے کشتہ مزاجی کیوں نہ آئے۔ ڈاکٹر صاحب بھی بات بات پر خراشی محسوس کر کے بلکہ سرگوشی پھر فراموشی اختیار کر لیتے ہیں۔ حکیم صاحب بھی ذرا فریفتہ مزاج واقع ہوئے ہیں۔ مریض کو دلچسپی کی بجائے ''Kill چسپی'' سے دیکھتے ہیں۔ چنانچہ کسی کے سر پر سٹھوسکوپ رکھی ہوتی ہے اور کسی کے گھٹنے پر۔ اگر کلینک میں کسی کو مچھر کاٹ لے تو اس کا

ایکسرے بھی تجویز کر دیتے ہیں۔ اگر کسی مریض پر فیس کی سکت نہ ہو تو سکتہ ان پر طاری ہو جاتا ہے۔ یہ حادثاتی طور پر کلینک آتے ہوئے لیٹ ہو جاتے ہیں جب گھر سے نکل بھاگنے کی کوشش کر رہے ہوتے ہیں تو ان کے ایک ہاتھ میں جرابیں جبکہ جوتے غائب ہوتے ہیں اس وقت محسوس ہو رہا ہوتا ہے کہ گھر میں ان کے جوتے کھانے والا ضرور کوئی موجود ہے جبکہ حقیقت میں ایسا نہیں ہے یہ اپنا جوتا چپائی بھی خود ہی کرتے ہیں اور پھر بھول کر بھی تلاش نہیں کر پاتے..... دوائی کی بجائے رسوائی کے ماہر ہیں بالکل ان سیاستدانوں کی طرح جو کام آنے کی بجائے کام دکھانے کے ماہر ہوتے ہیں کیونکہ سیاست اور مہارت مرکب بن کر زیادہ اکسیر ہو جاتے ہیں۔ آپ ہی فرمائیں کہ کوئی بھلائی فوٹو سیشن کے بغیر کرنے میں مزا ہے؟ بس فوٹو سیشن کے بل بوتے پر ان دونوں کا کام چل رہا ہے۔ آپ ان کے کلینک میں داخل ہوں تو پہلی پرہیز یہ آویزاں ملے گی کہ سیاسی گفتگو سے پرہیز کریں اور نسخے پر کان کھانے سے۔ بات کا آغاز یوں کریں گے کہ حکومت کو کیا بیماری ہے جو کہ مہنگائی دن بدن یا فلاں منسٹر کو نجانے کیا تکلیف شروع..... وغیرہ وغیرہ ان باتوں سے گفتگو سیاسی نہیں تو کیا سنیاسی ہو گی؟ ان کی اپنی بدہضمی کا یہ حال ہے کہ ذرا بڑا ڈکار بھی ہضم نہیں ہوتا اور سگریٹ پی لیں تو چہل قدمی کرنا پڑتی ہے۔ کلینک میں ایک نئی قسم کا حقہ رکھا ہے سگریٹ کا کش لگا کر اس کا دھواں اس حقے کی نالی میں چھوڑ دیتے ہیں جو کہ بعد میں ان کا کمپوڈر باہر چٹنی میں انجیکٹ کر دیتا ہے۔

ایک ڈکار، دو ہچکیاں، تین چھینکیں اور چار دفعہ کھانستے ہوئے جب یہ اپنے کلینک میں داخل ہوتے ہیں تو لگتا ہے کسی کے کلینک میں داخل ہو رہے ہیں۔ ان کی یہ حالت دیکھ کر ان کے مریضوں کے چہروں پر وہ رونق آ جاتی ہے جو کہ شاید غالب کے چہرے پر بھی نہیں آئی تھی..... محبوب؟ محبوب کیا خاکروب کے چہرے پر بھی نہیں..... کیونکہ یہ خاکروب پر کیا ''خاک رعب'' ڈال سکتے ہیں، کلینک کے آوے کا آوے ہی بگڑا دکھائی دیتا ہے۔ ان سے کوئی نفسیاتی مریض یہ پوچھ لے کہ محبت کرنے کا سب سے اچھا وقت کون سا ہے تو کہیں گے صبح دوپہر شام، رات کو مکمل آرام.....

یہ سانپ کا زہر ایسے چوستے ہیں جیسے کسی ''چونے'' سانپ نے کاٹا ہو۔ طبیعت اتنی وہمی پائی ہے کہ کوئی بدہضمی یا جزامی اور درد شکمی والا مریض آ جائے تو مجال ہے کہ اس کی نبض یا قبض کے بارے میں دریافت کریں۔ حکمرانوں کی طرح دور ہی سے سب اچھا ہے کی رپورٹ جاری کر کے پس پشت یا پس انگشت ڈال دیتے ہیں..... ایک مریض اکثر ان کے پاس موجود ہوتا

ہے جس کا نام بھی بھول گیا ہوں جسے شاید..... بہرحال اسے بھی بھولنے کی بیماری ہے کئی دفعہ تو وہ سانس لینا بھی بھول جاتا ہے جسے اسکی بیوی صرف اس لئے یاد دلاتی ہے کہ وہ آج کا خرچہ دینا نہ بھولے۔ ایک دفعہ ڈاکٹر صاحب کے پاس ایک عورت اپنا قومولود لیکر حاضر ہوئی جو کہ مچھر اہٹ کی وجہ سے ہکلا رہی تھی کہنے لگی، ڈاکٹر صاحب میرا یہ کٹ پیس ابھی سے باپ جتنا، غصہ کرتا ہے کوئی دوا تجویز فرمائیں وہ برجستہ فرمانے لگے دوا بچے کیلئے چاہئے یا اس کے باپ کیلئے؟.....

انہوں نے زندگی میں پہلی مرتبہ ایک مریض سے عاجزی سے پوچھا کہ وہ چائے پئے گا یا ٹھنڈا؟ اس نے کہا کہ آپ کو معلوم ہی ہے کہ مجھے شوگر ہے۔ دوبارہ اصرار پر اس نے کہا کہ چائے لیکن چینی کے بغیر۔ فوراً زوردار آواز دی۔ شربت، شربت ذرا جلدی۔ یہ مذاق سُننے ہی مریض برہم ہوکر روانہ ہوا۔ اس بے چارے کو کیا معلوم تھا کہ شربت حکیم صاحب کے کمپوڈر کا نام ہے۔ ایمرجنسی؟ ایمرجنسی کے مریض کا ہومیو یا حکیم کے پاس کیا کام ایسی صورتحال میں تو وہ خود کسی سرکاری ہسپتال میں خوار ہو رہے ہوتے ہیں۔ کیونکہ علاج بالمثل یا حکمت میں دوا کا تعین مریض کی طاقت سے پیوستہ ہوتا ہے۔ ایک دفعہ یہ مطب میں کرتب کر رہے تھے کہ ایک مریض زخمی حالت میں لایا گیا۔ پوچھا گاڑی کی ٹکر سے زخمی ہوا ہے یا چنگ لوٹتے ہوئے کیونکہ دوا دونوں حالتوں میں علیحدہ تعین ہوگی۔ پھر اس مریض سے یوں گویا ہوئے کہ گاڑی عورت چلا رہی تھی یا مرد؟ کیونکہ اس طرح سے دوا کی طاقت ذرا مختلف ہوگی۔ مزید پوچھا کہ عورت اگر سرکاری گاڑی چلا رہی تھی تو دوا جرمنی سے منوانا پڑے گی کیونکہ یہ پیچیدگی صرف پاکستان میں ہے۔ پھر اس مریض سے کہنے لگے کہ گاڑی سے تم لگے تھے یا گاڑی کیونکہ دونوں صورتوں میں دوا مختلف ہوگی پھر عینک سے آنکھیں چرا کر کوئی مزید علامت پوچھنے لگے تو مریض نے ہاتھ جوڑ کر بھاگنے کیلئے 3X کا راستہ مانگا۔ اس سے کہنے لگے کہ اس طرح راستہ مانگنے والے کی دوا کی طاقت ذرا زیادہ ہوگی۔ چنانچہ یہ مریض کی حالت اس سطح پر لے گئے جہاں ستیاناسی بوٹی بھی شاید اثر نہ دکھاتی..... ڈاکٹر حکیم بخش صاحب کو ابھی تک ان کی باتونی طبیعت بچائے جا رہی ہے حالانکہ زیادہ تر لوگوں کو یہ مروایا کرتی ہے۔ ایک دفعہ ایک گنجے مریض نے بے کاری کے باوجود اپنی ''مانگ'' میں اضافے کی شکایت کی تو اس سے فقط بال بچوں کا حال پوچھ کر ٹالتے رہے۔ اسی طرح ایک ماں نے شکایت کی کہ اس کے بچے کے اسہال کئی دنوں سے ٹھیک نہیں ہو پا رہے تو اسے یہ مشورہ دیا کہ بچے کو الٹی پینٹ پہنائے یعنی زپ والا حصہ پچھلی جانب کر دے تاکہ

آسانی رہے.....

حکیم بخش کا بھائی کچہری میں ایک کینٹین پر کام کرتا ہے اس کا نام عبدالوکیل ہے.....
دوسرا اخبار کے دفتر میں قاصد ہے اس کا نام ادیب ہے.....اس کی چھوٹی ہمشیرہ لیڈی کونسلر ہے اور نام ناظمہ ہے۔ ہمارے ملک میں مختلف قسم کے لوگ صرف اپنے پیسے، پیشے، پیری، پیکری، پوشاک اور پٹوار کے بل بوتے پر فائدہ اٹھا رہے ہیں اور سادہ لوح عوام کو پسماندہ لوح بنا رہے ہیں اسے کہتے ہیں "ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ" بہرحال ہومیو دوا اتنی بے ضرر ہوتی ہے کہ اس سے مریض اور مرض دونوں محفوظ رہتے ہیں۔

☆.....☆.....☆

نرگس

کسی مفکر نے کہا تھا کہ دنیا ایک سٹیج ہے جہاں پر ہر اداکار اپنا اپنا کردار ادا کر کے چلتا بنتا ہے لیکن میرے خیال میں مفکر نے کم از کم لاہور کے سٹیج کے بارے میں نہیں کہا ہوگا جس پر نرگس جیسی ''نز'' اداکارہ اپنے اعضاء کی شاعری باوزن کر رہی ہوتی ہے اسی لئے اسے پاکستانی ''ہیلن'' بھی کہا جاسکتا ہے۔ نرگس بڑی انصاف پسند اداکارہ ہے وہ پاکستان میں ہو یا امریکا میں، اپنا معیار ایک ہی رکھتی ہے۔ جس فلم میں نرگس ہو اس فلم کے ہیرو کو شفقت چیمہ سے بھی تعلقات میں بہتری لانا پڑتی ہے۔ بھارتی اداکارہ ہیلن کی جب پہلی فلم ریلیز ہوئی تو اسے فلم دیکھنے کیلئے سینما ہال جانے سے روک دیا گیا تھا کیونکہ ہیلن اس وقت نابالغ تھی اور فلم صرف بالغوں کیلئے تھی..... لیکن نرگس بڑی دبنگ قسم کی خاتون ہے اسے اس موقع پر سینما میں گھسنا بھی آتا ہے۔

لباس کے معاملے میں بھی نرگس بڑی گرم مزاج واقع ہوئی ہے اسی لئے وہ زیادہ موٹا لباس استعمال نہیں کرتی بلکہ پچھلے دنوں نرگس نے جب نیا مکان خریدا تو سب سے پہلے اس کا پلستر اتروا کر دیواروں پر نرم نازک روغن کروا دیا تھا تاکہ مکان ہوادار رہے میرے خیال میں یہ اس پہلوان کی شاگرد ہے جس نے اپنے مکان پر روغن کی بجائے بادام روغن کیا ہوا تھا۔

''ہزاروں سال ''نرگس'' اپنی بے نوری پہ روتی ہے''

لیکن نرگس اپنی سگی بہن کا ''دیدار'' کرتے ہوئے ہمیشہ مسکرا کر آداب بجالاتی ہے کئی دفعہ یہ دونوں بہنیں ایک دوسرے کا ''دیدار'' کرتے ہوئے شرما بھی جاتی ہیں لیکن بعد میں ان کو اپنے شرمانے پر بھی ندامت ہوتی ہے اور ان صاحب ذوق اداکاراؤں کو ایسی ''گری'' ہوئی حرکت زیب بھی نہیں دیتی۔

عام فلمی شائقین نرگس کے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ یہ بڑی ''بم'' قسم کی اداکارہ ہے اس لئے پچھلے دنوں ایک سائنسدان قسم کے شوقین نے نرگس کے بالوں کو آگ لگا کر تجربہ کرنے کی کوشش بھی کی تھی۔ نرگس بڑی اچھی قسم کی تیراک بھی ہے اس لئے فلم انڈسٹری میں خوبصورتی

سے ''ہاتھ پاؤں'' مارتا صرف اسی کا کام ہے اس کی صحت سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ہنوں کی طرح کھاتی ہے اور جنوں کی طرح پیتی ہے اس کے آگے پڑی ہوئی پلیٹ بھی پلیٹ فارم لگتی ہے اور سامنے کپ کی بجائے ٹب رکھا ہوتا ہے اگر اس کے سامنے کوئی مہمان بیٹھا کھا رہا ہو تو وہ کھانے کے ساتھ ساتھ اس پر ترس بھی کھا رہا ہوتا ہے بلکہ وہ اپنے معدے پر غصہ بھی کھا رہا ہوتا ہے۔ اس کی زندگی میں ایک ''سیاہ'' دور بھی گزر چکا ہے جب یہ ''بھٹی'' بن گئی تھی شراب کی نہیں بلکہ صرف ذات کی..... بہرحال ایک سے دو بہتر ہوتے ہیں اور اگر وہ بھی دو نمبر سے شروع ہو تو.....

ہماری یہ خوبصورت اور دلربا اداکارہ آج کل کئی رفاہی کاموں کے متعلق سوچ رہی ہے لیکن اسے ابھی تک کوئی اچھا رفاع ساز ہدایتکار نہیں مل سکا۔

نرگس ہر قابل ستائش کام بنفس نفیس کرنے کی خواہاں ہے لیکن قابل اعتراض کام نفس نفیس سے بھی نہیں کرتی بلکہ اپنے ہر خیر خواہ کو اس کار خیر سے باز رکھنے میں بھی کوشاں رہتی ہے۔ نرگس واحد اداکارہ ہے جو لکھی کم اور پڑھی زیادہ جاتی ہے اس نے میٹرک کا امتحان بھی امتیازی نمبروں سے پاس کیا تھا کیونکہ خوش قسمتی سے جب اس کا امتحان ہو رہا تھا اس وقت ہال کی سپرنٹنڈنٹ کا نام امتیاز بیگم تھا اور امتیاز بیگم کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ کسی ان پڑھ سے بھی امتیازی سلوک نہیں کرتی۔ تعلیم کی وجہ ہی سے اسے تمام اداکاروں میں امتیازی مقام بھی حاصل ہے لیکن اسے کبھی کبھی غصے کا دورہ پڑتا ہے کیونکہ اگر مکھی کے منہ میں شہد ہو تو پیچھے ڈنک بھی ہوتا ہے لیکن نرگس کبھی کسی کو ڈنک نہیں مارتی اگر کسی کو مار بھی دے تو خود ہی ''دم'' بھی کر دیتی ہے ورنہ کسی کے ناک میں دم کرنا بھی اسے آتا ہے..... بہرحال نرگس وہ خوش قسمت پھول ہے جس میں کانٹے نہیں ہوتے۔

آج کل سائنس کا دور ہے ہر پرانی چیز کی ہیت کو بدلا جا رہا ہے پرانے گانوں کو ری مکس کرنے کے بعد صرف نرگس ہی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے شکر ہے ابھی صرف گانے ہی ری مکس ہو رہے ہیں لیکن مجھے خطرہ ہے کہ کہیں مہدی حسن کو ری مکس کر کے دلیر مہدی نہ بنا دیا جائے۔

ہماری اس باصلاحیت اداکارہ کیلئے آہ بھرنا اور ہینگ بھرنا زیادہ مشکل نہیں عام طور پر ہر ہدایتکار فلم بینوں کے دلوں میں تھرتھراہٹ پیدا کرنے کیلئے کیمرے کی صفائی سے کام لیتے ہیں لیکن نرگس کی عاجزانہ اداؤں کی وجہ سے ہدایتکاروں کو سنسر سے بچنے کیلئے کیمرے کی صفائی سے کام لینا پڑتا ہے فلم بینوں کی خواہش ہے کہ نرگس کا حسن اور نرگسی کوفتوں کی خوشبو گلبرگ سے آتی رہے۔

☆.....☆.....☆

سائن بورڈز

آج کل سائن بورڈ کا معاملہ بہت گرم ہے اور MMA مولانا مائیٹرنگ ایجنسی والے ہر اس سائن بورڈ کو توڑ رہے ہیں جس پر کسی غیر محرم عورت کی تصویر بنی ہوئی ہو۔ میرے شاگرد کے بقول اب یہ سائن بورڈ بھی "بورڈ" ہو جائیں گے اور ان پر صرف عبارتوں ہی سے کام چلایا جا سکے گا ..... کھلی آزادی کے باعث ہمیں ہر جگہ اور ہر چیز پر ہدایات کی روشنی راستہ دکھاتی رہتی ہے۔ کہیں پر آپ کو نوٹس بورڈز لگے ملیں گے اور کہیں پر انتباہ سے آگاہی اور جرمانہ۔ یہ ہدایات آپ کی جان بچانے کیلئے نہیں ہوتیں بلکہ اگر کسی نے قیمت، جرمانے یا کسی اور وصولی سے آگاہ کرنا ہو تو آپ کو یقیناً کسی چھپنے یا نوشتۂ دیوار پر کچھ نہ کچھ لکھا ہوا مل جائے گا۔ ایک دفعہ ایک سائن بورڈ جس پر کچھ ہدایات لکھی ہوئی تھیں اسے رات کو دیمک لگ گئی۔ صبح وہاں ایک اور تحریر لکھی ہوئی تھی کہ ہمارا بورڈ فوراً واپس کر دو ورنہ ہم تمہاری مٹی خراب کر دیں گے۔ آیئے اب مستقبل کے نیک سائن بورڈز سے مستفید ہوتے ہیں.....

☆ گلوکوز کی بوتل پر مریض نے یہ تحریر پڑھی.....
سکرین ثابت کرنے والے کو پانچ صد روپے انعام۔

☆ منرل واٹر کی بوتل پر لکھا ہوا ہوگا.....
ہمارے منرل واٹر سے فصلوں کی پیداوار میں یقینی اضافہ

☆ ایک سینما کے باہر فلم کی کامیابی کا اظہاریوں ہوگا.....
۲۰۰۲ء کے ریفرنڈم کی طرح ہاؤس فل

☆ چنے کے پیکٹ پر یہ تحریر ہوگا.....
ناکوں چنے چبوانے کیلئے مفید ترین چنے

☆ نمک کے پیکٹ پر یہ لکھا ہوگا.....

زخموں پر نمک پاشی کیلئے اکسیر ترین

☆ پکی پکائی روٹی کے پیکٹ پر یہ راز افشاء ہوگا
اس کا استعمال زیادہ سے زیادہ کرلیں کیونکہ پلانٹ مکمل طور پر بند ہونے والا ہے۔

☆ زیرہ کے پیکٹ پر یہ تحریر ہوگا
اونٹ کے منہ میں دینے کیلئے لاجواب

☆ سونے کی اینٹ پر یہ سنہری حروف لکھے پائے جائیں گے.....
راتوں کو جگانے کیلئے موثر ترین دھات

☆ چوسنی پر لکھا ہوگا.....
مکھی چوسوں کی مشق کیلئے کارآمد

☆ چھت والے پنکھے پر لکھا ہوگا.....
گرمیوں کے بعد بلیڈز یعنی پَروں کو اتار کر استعمال کریں

☆ انکم ٹیکس کے دفتر کے باہر کوئی شرارت سے یہ لکھ جائے گا.....
فلمی ستاروں کی نیندیں حرام کرنے کیلئے سرکاری سطح پر کوشاں

☆ کیلکولیٹر پر یہ لکھا ہوگا.....
اس پر دولت کے علاوہ اعمال کا بھی جائزہ لیجئے

☆ کراچی کے ایک امتحانی سنٹر کے باہر یہ تنبیہ لکھی ہوگی.....
آج صرف صبر کا امتحان ہوگا
نقالوں سے ہوشیار!

☆ چائے کے ڈبے اور صابن پر ایک اہم ترین ہدایت لکھی ہوگی۔
شیخ صاحبان پیکنگ کھول کر استعمال کریں۔

☆ ایک گرائنڈر پر یہ لکھا ہوگا.....
مونگ کی دال دلنے کا متبادل ذریعہ

☆ مارفین کے ٹیکے پر یہ ری ایکشن درج ہوگا۔
دواء کے استعمال سے اونگھ آنے کی شکایات ملی ہیں۔

☆ کار کی بک لٹ میں لکھا ہوگا.....

شیر خوار ڈرائیورز بیلٹ کا استعمال لازمی کریں۔

☆ بستر کی قینچی چادر پر لکھا ہوگا.....
چادر کے مطابق پاؤں پھیلانے کی اضافی سہولت

☆ پولیس کے ٹرک پر لکھا ہوگا.....
لائسنس ہمراہ ہے

☆ کھیر کے ڈبے پر لکھا ہوگا.....
ہضم نہ ہونے کی صورت میں فوراً ماہر حیوانات سے مشورہ کریں۔

☆ شربت کی جعلی بوتلوں کا نیا نام یہ تجویز ہوگا.....
روح قبضہ راحت جان.....انجام "شیریں"

☆ صابن کے اوپر لکھا ہوگا.....
کالے دھن کا یقینی اُجلا پن۔

☆ ایک ضرب المثل کی وجہ سے ایک پیکنگ پر یہ لکھا ہوگا.....
مسور کی دال کے ساتھ ایک خوبصورت آئینہ مفت

☆ چاول کے پیکٹ پر لکھا ہوگا.....
ہماری مصنوعات خیالی پلاؤ پکانے کیلئے نہیں

☆ موٹے ناول پر یہ لکھا ہوگا.....
آپ اسے ردّی کے طور پر بھی استعمال کر سکتے ہیں۔

☆ رنگین کنٹیکٹ لینز پر یہ اضافی خوبی پائی جائے گی.....
وشن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کیلئے مفید

☆ اداکارہ امبر کے گھر واقع فنکار کالونی B-52 کے باہر یہ لکھا جائے گا۔
اداکارہ بمبر B-52

☆ ہائی سکول کے ایسوسی ایٹ ماسٹر جی نے طالب علموں کو چھٹیوں کا یہ مختصر کام دیا.....
کتاب کے پہلے صفحے سے لیکر آخری صفحے تک لکھنا اور زبانی یاد کرنا

☆ بیان پر یہ خوبی لکھی ہوگی.....
گریبان سے جھانکنے کی گارنٹی

☆ حجام نے لکھوا رکھا ہوگا..... یہاں بال ''بلیک'' نہیں ہوتے
ہسپتال میں مریضوں سے التماس ایسے لکھا ہوگا ''ILL التماس''

☆ مستقبل میں دوکانوں پر یہ بھی لکھا ہوسکتا ہے.....
خشک پانی دستیاب ہے

☆ جوتے بنانے والی ایک کمپنی نے یہ آفر پیش کرے گی.....
جوتوں کا ہار بنانے کیلئے بیش قیمت ڈوری مفت

☆ ایک امریکی تابوت پر یہ دعویٰ کیا گیا.....
''لائف ٹائم'' گارنٹی کے ساتھ۔

☆.....☆.....☆

تالا اور چور

گھر میں اگر خدا کا دیا سب کچھ ہو لیکن گھر والے موجود نہ ہوں تو ایک چیز ضرور موجود ہوتی ہے اور وہ ہے تالا..... اور اگر تالا موجود نہ ہو تو گھر میں چور ضرور ہوتا ہے اور پھر وہ دوران کارروائی کوئی زنگ آلودہ اور پرانا تالا بھی نہیں چھوڑتا جو وہ اپنے بیگ میں نہ ڈالے اور اگر کوئی ڈاکو گھر میں داخل ہو تو وہ اپنی ''دیہاڑی'' شروع کرنے سے پہلے صرف چابیاں مانگتا ہے، اس وقت وہ گھڑی کی چابی کی طرف دھیان نہیں دیتا اور ڈکیتی کے وقت سے پندرہ منٹ پہلے ہی ''زیادتی'' شروع کر دیتا ہے۔

سنا ہے عرب ریاستوں میں دکاندار اپنی دکانوں کی بغیر تالا بندی کیلئے نکل جاتے ہیں اور انہیں چوری چکاری کا کوئی ڈر نہیں ہوتا لیکن ہمارے تھانوں میں سپاہیوں کے سوٹ کیسوں پر تین تین ''پھولوں'' والے تالے لگے ملتے ہیں یعنی وہ آپس میں بھی ایک دوسرے پر اعتبار نہیں کرتے بلکہ وہاں پر موجود چوروں کی فائلیں بھی تالوں میں ہوتی ہیں اور چور چابی کی طرح ''باہر'' ہوتے ہیں..... تالا ''نظر'' کا رشتہ دار ہے اگر یہ کسی کے گھر کے باہر مستقل لگا رہے تو سمجھ لیجئے گھر والوں کو نظر لگ چکی ہے۔ تالے کیلئے ضروری نہیں کہ یہ کسی دھات کا بنا ہو۔ یہ بٹن، ازار بند، پاس ورڈ اور سلائی کی صورت میں بھی وقوع پذیر ہو سکتا ہے بعض اوقات یہ نظر نہیں آتا لیکن لگا ہوتا ہے۔ اگر ایسی صورتحال کسی حکمران میں پیدا ہو جائے تو پھر آفات کے تالے کھل جاتے ہیں جسے خدا تعالیٰ نے ڈھیل دے کر ایسے بند کیا ہوتا ہے، جیسے یہ کسی کے کانوں، آنکھوں اور زبان پر لگا ہوتا ہے۔ انگریز کہتے ہیں'' Never Bolt your door with boiled carrot'' یعنی اپنے دروازے کو کبھی ابلی ہوئی گاجر سے بند نہ کرو۔ آج کل جتنے جدید سے جدید تالے مارکیٹ میں بکنے آ رہے ہیں اتنے ہی چور ڈبیجٹل ہوتے جا رہے ہیں لڑکی والے بھی لڑکے والوں کو جہیز میں تالا نہیں دیتے لیکن لڑکی دے دیتے ہیں کیونکہ وہ ایک وقت میں ایک ہی مونث دینا چاہتے ہیں۔ چنانچہ تالا صرف اس وقت ہی کھل پاتا ہے جب اس کی اصل شریک حیات اس کی پیٹھ میں گھونپ دی جائے پھر وہ کھل کھلا کر کھلتا ہے۔ تالا مصریوں

کی ایجاد ہے اور اس دور کے دریافت ہونے والے زیادہ تر تالے لکڑی کے بنے ہوئے ہیں۔ امریکا کے لاک ماسٹر ''ایل'' نے جو تالا انیسویں صدی میں ایجاد کیا اس میں کوئی سوراخ نہیں تھا کیونکہ اس دور میں سوراخ کے راستے دھماکہ خیز مواد ڈال کر اس کی ہولی منائی جاتی تھی اور تالا دھماکے کی نظر ہو جاتا تھا۔

آج کل یہ بات حواس باختہ لوگوں کیلئے باعث اطمینان ہے کہ تالا چابی سے بھاری ہوتا ہے ورنہ پروفیسر حضرات کی جیبوں سے چابی کی بجائے تالے ملتے اور چابیاں؟ سائنس نے ہر جدید چیز کے ساتھ تالے کا ''اجالا'' کر دیا ہے اور تقریباً ہر چیز یا Devicel کے ماتھے پر تالے کا ٹیکہ لگا دیا ہے تاکہ چور کو ہر چوری سے قبل ذرا غور فرمانا پڑے لیکن چور اپنی قابلیت کی وجہ سے اپنے سکور میں اضافہ جاری رکھتا ہے اور تالے کو تر نوالہ سمجھ کر نگل لیتا ہے لیکن سائنس دانوں نے کوئی ایسا جوتا ایجاد نہیں کیا جس پر چور سوئچ لگا ہو جو جوتا چور کے چھونے ہی سے شور مچانے لگ جائے لیکن کیا کیا جائے ان چوروں کے پاس تو ہر تالے کی گولڈن یا ماسٹر Key ہوتی ہے اور ان کے پیچھے ضرور کوئی ماسٹر مائنڈ ہوتا ہے جس سے وہ ہمارے اسٹیٹ بینک کے تالے بیک ڈور سے کھول لیتے ہیں۔ چابی چور اور چکور تالوں کی فکرمندی صرف مالداروں کو ہوتی ہے اور جو لوگ علم کی دولت سے مالا مال ہوتے ہیں انہیں اپنے علم کی نقب زنی کا کوئی خوف نہیں ہوتا اور نہ ہی کوئی سوئیڈش اکاؤنٹ ہولڈر ان کی اس دولت کا صفایا کر سکتا ہے۔ آج ہمارے نوجوانوں کو اس بات کی ضرورت ہے کہ وہ محنت کر کے صرف علم کی دولت کے پیچھے بھاگیں ورنہ وہ تالوں اور چابیوں کے چکروں سے کبھی نہیں نکل سکیں گے۔ آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ چابیوں کے گچھے میں جو چابی زیادہ استعمال ہوتی ہے صرف وہی چمکتی ہے لیکن یہ بھی یاد رکھیں گھڑا بھی وہی ٹوٹتا ہے جو پانی زیادہ ٹھنڈا کرتا ہے۔ بہرحال علم کی دولت حاصل کرنے کیلئے دل چھوٹا نہ کریں، مایوسی ایک بڑا گناہ ہے، علم کی دولت ہوگی تو پھر دوسری دولت خود بخود قدموں میں گرے گی۔ لہٰذا میرے نوجوانو! ''لاکروں'' کے چکروں سے ذرا بچو، کوالیفکیشن کے ساتھ ساتھ ایجوکیشن بھی ضروری ہوتی ہے۔ دنیاوی تالے پر عدم اعتماد کر کے صرف خدا تعالیٰ پر بھروسہ کیجئے۔

☆.....☆.....☆

''مجرے مانہ'' حرکتیں

ایک شخص ایک اداکارہ کو بڑے بولڈ انداز میں ایئرپورٹ چھوڑنے آیا۔ اداکارہ نے آنسو پونچھے اور لاؤنج کی طرف بڑھی۔ ایک بڑھیا جو اندر بیٹھی یہ جذباتی سین دیکھ رہی تھی اسے تسلی دینے کی خاطر گویا ہوئی۔ تم رو رہی ہو کیا میکے جا رہی ہو؟ کہنے لگی نہیں میں اپنے خاوند کے پاس جا رہی ہوں اور یہ فلمی تھے..... اداکار فیملی کی طلاقیں بھی ایسے ہی ڈرامائی ہوتی ہیں۔ اپنی ترقی پسند حرکات ولذات سے آراستہ ہماری یہ اداکارائیں شادیوں سے دوچار ہوتی رہتی ہیں اور ان کے نصیبوں میں شاید جاوید شیخ جیسا منہ بولا خاوند لکھ دیا جاتا ہے کیونکہ ان میں سے کچھ ''عدت پسند'' واقع ہوئی ہیں۔

اداکاری سے فسلک کام واقعی بہت مشکل ہوا کرتے ہیں لیکن ہر اداکار اور اداکارہ کے منہ پر یہ آسان سا جملہ ہوتا ہے کہ ''اداکاری بہت مشکل کام ہے''، حالانکہ رائٹر انہیں کہانی دیتا ہے اور ہدایت کار ایک ایک لفظ اداء کرنے کی ہدایت دیتا ہے۔ میک اپ والا ان کا حلیہ کردار کے مطابق بناتا ہے۔ ایک مختصر سین کو (صبر شکر کے ساتھ) کئی مرتبہ ٹیک کر کے اوکے کیا جاتا ہے خطرناک سین سٹنٹ مین سے کروانے کے بعد جو کہ پھر بھی ''ہولے'' رہتے ہیں، اداکاروں کے لبوں پر یہی الفاظ ہوتے ہیں کہ اداکاری بہت مشکل..... اسٹنٹ مین بھی ایسے ہیں کہ وہ کریم رول کا رول ادا کرنے پر فوری تیار ہو جاتے ہیں..... جس طرح فلم اور سیاست میں کئی چیزیں مشترک ہیں اسی طرح سیاست دانوں اور اداکاروں میں بھی ہیں۔ ہمارے ملک کی فلمیں ہماری جمہوریت کی طرح فلاپ نظر آتی ہیں جمہوریت کی تو سمجھ آتی ہے لیکن کم از کم فلموں کو فلاپ نہیں ہونا چاہئے کیونکہ فلموں میں ہر ناممکن چیز کو ممکن بنایا جاسکتا ہے اگر ہدایت کار چاہے تو جہاز کو پرندے کی طرح اڑا کر فلم بند کرسکتا ہے وہ جانی نقصان پورا کرنے کیلئے ہیرو اور ولن کی بیس بیس شادیاں کروا سکتا ہے، مزید یہ کہ کسی ''فلمی'' ملک سے مارشل لاء کا خاتمہ کر کے جمہوریت کی راہ پر گامزن کروانا اس کیلئے کونسا مشکل ہے؟ ویسے بھی فلم اور سیاست میں کوئی چیز حرف آخر نہیں ہوتی۔ فلم بنانا بھی کوئی کھیل نہیں ہے اگر یہ کھیل ہوتا تو فلمیں صرف سیالکوٹ

میں ہی بنا کرتیں اور نہ ہی یہ خالہ جی کا گھر ہے ورنہ یہ فلمیں کراچی میں بنا کرتیں اور اسے لالی وڈ کی بجائے سالی وڈ اور کالی وڈ کہا جاتا۔ (سیالکوٹ اور کراچی والے غور فرمالیں) فلم کی بجائے ڈرامے کو کھیل کہا جاتا ہے جسے آپ ہر شب ملاحظہ کرتے ہیں اس کے آخر میں کھیل بھی خاص طور پر پیش ہوتے ہیں۔ اس کھیل میں واقعی بہت سسپنس ہوتا ہے۔

یہ اڑی اڑی سی رنگت یہ کھلے کھلے سے گیسو
تیری صبح کہہ رہی ہے تیری رات کا فسانہ

ہمیں ''ریما کی راکھ صائمہ کے سر'' ڈالنے کی بجائے اصل حقائق کی طرف آنا چاہئے آیا کہ ہماری ''رنگیں'' فلم انڈسٹری کا سہاگ کیونکر اجڑا۔ حالانکہ کسی اداکارہ کا سہاگ تو ساری عمر نہیں اجڑتا انڈسٹری کی زبوں حالی اور طوائف الملوکی کی آخر وجہ کیا ہے۔ یوں تو ہر محکمے میں انسانی اقدار کے حوالے سے معذوروں کا کوٹہ رکھا جاتا ہے لیکن فلم انڈسٹری کیلئے مشورہ یہ ہے کہ وہ علمی طور پر معذور اداکاروں کو انڈسٹری سے زیادہ سے زیادہ سنسر یا ایڈٹ کرے۔ چونکہ فلموں میں ہر چیز ممکن ہے اس لئے ہماری گجروں اور جٹوں کے نام سے شروع ہونے والی فلمیں ہمیشہ کامیاب رہتی ہیں لہٰذا فلموں کی حد تک یہ بھی ممکن ہے ''شریف گجر'' اور ''بیلا جٹ''۔ گجر دودھ کے برتن اور کنے کرائے پر پانی پھیرنے میں ماہر ہوا کرتے ہیں۔ فلم بین اعتراض کرتے ہیں کہ فلم میں گجر کو گائے سے پیار کرتا کبھی نہیں دکھایا جاتا۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ہمارے ملک میں سب چلتا ہے یعنی گجروں والی فلمیں اور ملاوٹ والا دودھ، فلمسازوں کو چاہئے کہ وہ گجر پروڈکشن کو چھوڑ کر ''میاں'' کارپوریشن شروع کریں اور فلموں کے نام یوں رکھیں یعنی..... بدنامیاں، سلامیاں، ناکامیاں، معصومیاں، اور ''محرومیاں'' یعنی ''خاوندوں کے حوالے سے یہ نام فلم کی کامیابی کا سامان ہو سکتے ہیں پنجابی فلم ''دیوے'' کو یوں لکھیں ''THE WAY'' خاوند سے یاد آیا یہاں کے کچھ لوگ عقد کی بجائے صرف ''عقیدت'' سے کام لیتے ہیں جیسے کچھ لوگ اپنی اہلیت کی بجائے اہلیہ سے..... ہماری فلم انڈسٹری پٹنے کی اصل وجہ ہماری آج کل کی سینما سکوپ اداکارائیں ہیں پانی کی حقیقت اپنی جگہ لیکن گٹر کے پانی کو پانی سمجھ لینا دھوکہ ہے اور یہ دودھ میں اگر کسی طرح مل جائے تو دودھ ہی کہلائے گا بہتر ہے اسے پہلے ہی روک لیا جائے..... فلم انڈسٹری میں داخلے سے پہلے ہماری ہر اداکارہ کا طبی معائنہ ہونا چاہئے جو کہ انسان دوست نان سٹک پولیس سے کروانا چاہئے ورنہ یہ طبی کی بجائے ''ٹبی معائنہ کہلائے گا'' اس کے باوجود ہماری اداکاراؤں میں صلاحیتوں کی کمی نہیں یہ مُنّی سے دنیٰ تک اپنے جوہر دکھا رہی ہیں چنانچہ

صرف ایسی عورتیں ہی اپنے بندوں پر ''کھلے بندوں'' تنقید کر سکتی ہیں۔

کسی اداکارہ کی کامیابی کیلئے ضروری ہے کہ اس کا رنگ تور جیسا، آنکھیں نرگس جیسی اور بال ریشم جیسے ہوں اگر ہونٹ شبنمی اور چہرے پر ''بہار'' ہو تو نیا مسئلہ کھڑا ہو سکتا ہے جتنی دیر میں ہماری ہیروئن تیار ہوتی ہے اتنی دیر میں ایک بڑی دیگ تیار ہو جاتی ہے لیکن ہیروئن کو میک اپ کے ''دم'' میں رکھنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ پہلے پہل ہماری ہیروئین، قاینوں اور دیگر اشیاء کے اندر چھپا کر باہر بھیجی جاتی تھی اب تو سرعام بھیج دی جاتی ہے۔ سر سے یاد آیا ہیروئن اپنے بالوں کی جتنی بھی حفاظت کر لے اس کی قسمت میں 125 سی سی گنجا لکھا ہوتا ہے۔ ہماری یہ ہیروئن نما اداکارائیں کبھی کسی ایک جگہ نہیں ٹکتیں ان کی گاڑی کا نمبر بھی او کے 9211 یعنی نو دو گیارہ ہوتا ہے کیونکہ ان کے لواحقین انہیں بے یار و مددگار چھوڑنا پسند نہیں کرتے۔ اگر کسی وجہ سے ان کی شادی فلاپ ہو جائے تو ساتھ ہی شوبزنس چمک اٹھتا ہے۔ قارئین! اپنی خدمات پیش کرنے والے کو مزدوری یا اجرت دی جاتی ہے لیکن اداکار کو معاوضہ؟ معاوضہ تو نقصان پورا کرنے کیلئے دیا جاتا ہے اگر ایسا ہے تو اداکارہ کو فلم کا ہرجانہ ملنا چاہئے۔ اس بات کو عقل نہیں مانتی فلموں میں ویسے بھی عقل کی بجائے شکل کو اہمیت دی جاتی ہے اور شکل کے حساب سے معاوضہ طے کیا جاتا ہے لیکن پشتو فلموں میں اس کے بالکل الٹ ہوتا ہے اور اسی لئے اداکارہ کو معاوضہ بھی کم دیا جاتا ہے مسرت شاہین نے اسی وجہ سے پشتو فلموں سے اپنی پیٹھ پھیر لی ہے تاکہ چہرے اور جسم کی ''مساوات'' قائم رہے۔

سنا ہے کچھ عرصہ پہلے اچھی فلمیں بنا کرتی تھیں اور سب محنت کیا کرتے تھے اداکار اپنا کردار اتنا خوب ادا کرتے تھے کہ اصل کا گمان ہوتا۔ اداکارہ فردوس نے ایک فلم میں مرد کا کردار اتنی خوبصورتی سے کیا کہ فلم کی نمائش کے موقع پر اس کی مونچھیں نکل آئیں اور لوگ اسے فردوس جمال سمجھنا شروع ہو گئے۔ اسی طرح الیاس کشمیری نے فلم میں عورت کا کردار اتنا ڈوب کر ادا کیا کہ مہینہ کے اختتام پر انہیں کئی نسوانی عارضے لاحق ہو گئے اور کئی حکیموں نے مل کر ''کورس'' کی صورت میں انہیں افاقہ دلایا۔ پرانا وقت ویسے بھی فلموں کی کامیابی کا تھا ہر شخص فلم ہیرو بننے کا شوقین تھا۔ آجکل انہیں فلموں (کے ڈبوں میں) کریکٹر ایکٹر چوہے کام کر رہے ہیں باقی دنیا میں پرنٹ سے پہلے نیگو بنتا ہے لیکن ہماری پوری فلم ''نیگیو'' ہوتی ہے مگر ہاں! ہماری فلم پٹ جاتی ہے اداکارہ ہٹ ہو جاتی ہے۔ ہے نا عجیب بات؟ پیسے کمانے کے ڈھنگ اور ڈھونگ میں فرق ہوتا ہے ان فلموں میں جھوٹی شہرت کیلئے سچی محبت فلمائی جاتی ہے یہ جھوٹ فلموں کی

طرح سیاست میں بھی آ چکا ہے ایک وقت ایسا آنے والا ہے جس میں جھوٹے کو جھوٹ بولنے پر شعر کی طرح داد دی جائے گی۔ فلم بین ہماری اداکاراؤں کی حرکات کو فلم انڈسٹری کی تباہی کا ذمہ دار قرار دے کر انہیں اپنی ''مجرے مانہ'' حرکتوں سے باز آنے پر زور دے رہے ہیں دیکھئے! کسی بور فلم میں دس منٹ کا ایکشن سے بھرپور وقفہ بھی تفریح فراہم کر دیتا ہے اگر مصروفیت کے اس دور میں تین گھنٹے کا ایسا ہی وقفہ تیار کر لیا جائے تو اسے خاموش طبع شائقین بھرپور طریقے سے انجوائے کر سکیں گے، یعنی شور کے پلوشن کے بغیر فلم.....

''کھانا جنگی''

حافظ حسین احمد صاحب اپنی شگفتہ مزاجی کی وجہ سے اسمبلی میں اپنا ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ آج کل وہ ہم خیال ممبران کی نہ صرف امامت کرواتے ہیں بلکہ اسمبلی کے مزاح گویوں کی امامت بھی سنبھالے ہوئے ہیں۔ اگر ان سے کوئی ممبر اسمبلی یہ کہے کہ مولانا جی آج روزہ لگ رہا ہے تو وہ اس سے یقیناً یہ فرمائیں گے کہ ''تم ایک نمبر بڑا روزہ رکھ لیتے''۔ اگر مولانا صاحب سے کوئی یہ بھی پوچھ لے کہ بھوک میں چنے بادام کیوں محسوس ہوتے ہیں تو وہ یوں گویا ہونگے کہ کیا تمہیں ضرورت پڑنے پر گدھے کو باپ بنانے والا پرانا آرڈیننس بھی معلوم نہیں۔ بہرحال میرے کئی دوست روزہ تو رکھ لیتے ہیں لیکن افطار کے وقت ان کا دسترخوان ''کھانا جنگی کا'' منظر دارالجماعت سے براہ راست پیش کر رہا ہوتا ہے۔ ان میں سے میرا ایک بظاہر سیدھا سادھا نظر آنے والا دوست گلوتامی ہے جو اپنا الو دسترخوان پر سیدھا رکھنے کا ہنر جانتا ہے۔ جہاں پر وہ کھاتے کھاتے بیماریوں کے کھاتے کھول رہا ہوتا ہے۔ وہ کھانے سے ہاتھ کھینچتے ہوئے بھی دو تین انسانوں کا لقمہ کھینچ لیتا ہے۔ ہمارے گروپ میں بطور ایک اصولی آدمی مشہور ہے۔ مثلاً وہ ''ڈنر سیٹ'' میں لنچ کرنے والوں کا ہم خیال نہیں مگر:

کھانے اور زخموں پر یکساں نمک چھڑکتا ہے اور کھانا کھاتے ہوئے اس کی پانچوں انگلیوں پر یکساں گھی نظر آ رہا ہوتا ہے۔ حالانکہ کہا جاتا ہے کہ پانچوں انگلیاں ایک سی نہیں ہوتیں اور وہ بھی گھی میں؟ اسے کئی دفعہ سمجھایا گیا ہے کہ پرہیز علاج سے بہتر ہے وہ کہتا ہے کہ میرا بھوئی ڈاکٹر ہے۔ لہٰذا جسے علاج مفت میسر آئے اسے پرہیز سے گریز کرنا چاہئے اور پیٹ کو مطور مجن سے لبریز کرنا چاہیے۔ حالانکہ پیٹ کو انسانی جسم کا سب سے تھکا ہوا اعضا کہا جاتا ہے اور زود ہضم معدے والے کو ایک صحت مند اعضاء دار..... لیکن گلو اپنے معدے اور پیٹ کو ان تمام اعضاء کا ڈسٹرکٹ ناظم قرار دے کر جگر، گردوں اور پھیپھڑوں کو لیبر کونسلر بھی نہیں سمجھتا۔ گویا گلو اس میں بھوک کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے اور بھوک کیلئے پیٹ ایسے ہی ناظم و ملزوم ہے جیسے کسی ناظم کیلئے سرکاری حمایت لیکن کاٹھ کی ہنڈیا بار بار نہیں چڑھتی۔ وہ صرف ایک رات

تھانے میں رہا ہے اور واپسی پر یہ بیان دیا ہے کہ

گر آپ نے ہے کھانا، تو ڈھونڈو اچھا تھانہ..... کھانے میں شب بسری صرف اس بیان کی وجہ سے ہوئی کہ لوگ مجھے کہتے ہیں کھا گیا گلو پی گیا گلو حالانکہ لوگ اوجڑی کیمپ کے میزائل تک کھا گئے .....

لوگ بھی اسے خوامخواہ برا بھلا کہتے ہیں حالانکہ وہ کھاتے ہوئے ضرور برا محسوس ہوتا ہے لیکن بعد میں ڈکار کے انتظار میں نہایت بھلا محسوس ہو رہا ہوتا ہے۔ نان شاپ نان کھانے والا یہ معصوم گلو کھانے کیلئے ذات پات کی تمیز سے بھی انکاری ہے اس لئے کبھی وہ کہتا ہے کہ

میں بھی رانا تو بھی رانا
شروع کریں مل کے کھانا

اور دوسرے ہی لمحے یہ کہتا ہے کہ

میں ہوں بٹ اور تو ہے جٹ
کچھ بھی ملے کر دیں چٹ

عام طور پر پیٹ میں جب مناسب کھانا جاتا ہے تو وہ یہی پیٹ پورا جسم اٹھائے رکھتا ہے لیکن گلو الٹا اپنے پیٹ کو اٹھائے پھرتا ہے۔ ملکوں کا مال کھانے کیلئے ہاتھوں اور منہ کی ضرورت نہیں پڑتی۔ بلکہ صرف چند چمچوں کی ضرورت ہوتی ہے جو کہ مال کو گراس روٹ لیول سے نکالنے میں مددگار ثابت ہوتے ہوں۔ گلو کو سب دوست کہتے ہیں کہ دسترخوان پر کھانا جنگی کی تمہاری اب کافی نیٹ پریکٹس ہو چکی ہے۔ اب تم خزانے کے دسترخوان پر بھی ہاتھ صاف کرنا شروع کرو تو وہ کہتا ہے کہ بچھو کا منتر ابھی نہیں آیا ہے اور سانپ کے بل میں ہاتھ دوں؟ المیہ یہ ہے کہ اس کا ابھی کوئی چمچہ نہیں اور ایک لکڑی کبھی نہیں جلتی اور نہ ہی ایک ہار کا گلدستہ بنتا ہے وہ کہتا ہے جو آگ کھائے گا وہ انگارا اُگلے گا، لہٰذا میں آپ کے سامنے ''کھانا جنگی'' کرتا ہوں، چوری چھپے نہیں۔

☆.....☆.....☆

الجھنیں ہی الجھنیں

ایک میگزین کا صفحہ یوں ترتیب دیا گیا تھا.....

یقین کیجئے! میں نے عام لوگوں کی الجھنوں کو حل کرنے اور انہیں اس بارے میں مشورہ دینے کے معاملے کو نہایت آسان سمجھ کر یہ صفحہ ترتیب دینے کا سوچا تھا لیکن نفسیاتی مسائل کے خطوط کا ڈھیر دیکھ کر یہ اندازہ ہوا کہ جیسے ہمارا ہر شہری ہی نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہے اور ان الجھنوں کی وجہ سے معاشرے میں ایک الگ قسم کی پلوشن پھیلی ہوئی ہے، خیر جیسی میری قسمت تھی ویسے حالات کا میں شکار ہو چکی ہوں۔ اگر آپ کے پاس کوئی مشورہ ہو تو مجھے اس صفحے کی ڈیوٹی سے جان چھڑانے کیلئے ضرور دیں۔ میں قارئین سے امید رکھتی ہوں کہ وہ ''انسانوں'' کی طرح اپنی الجھنیں ارسال کریں گے اور قلم و قلب کو قابو میں رکھیں گے۔ آپ کو علم ہونا چاہیے میں ایک حساس میگزین کی ایک حساس مصنفہ نازک ہوں اور میں آپ کی خبر لینا خوب جانتی ہوں پھر یہ نہ کہنا کہ خبر نہ ہوئی۔ آپ سے یہ امید بھی رکھتی ہوں کہ آپ اپنی الجھنیں قلم بند کرتے ہوئے ''کوموں'' میں بند کرنے کے بعد لفافے کو بھی بند کریں تا کہ مجھے اور میرے ادارے کو کوئی الجھن نہ ہو۔

بہرحال آپ کی الجھنیں ہمارے سر ماتھے پر۔ ہم اس سلسلے میں کوئی کمیشن بھی نہیں لیتے۔ اگر آپ ہمارے جواب سے بہریاب نہ ہوں تو ہمیں دوبارہ لکھئے۔ (ایڈیٹر)

وقار مجروح..... کراچی

س۔ مجھے نشہ کرنے کا شوق ہے چونکہ میرا تعلق ایک غریب گھرانے سے ہے اس لئے میں عجیب و غریب الجھنوں کا شکار ہو چکا ہوں۔ میری خوش نصیبی ہے کہ میں ڈیزل سونگھنے کا نشہ کرتا ہوں جو کہ میں سمجھتا ہوں کہ ایک ارزاں سا نشہ ہے لیکن اب قیمتوں کے اضافے کے باعث وہ بھی پہنچ سے دور ہوتا جا رہا ہے۔ میں صرف آدھا لیٹر ڈیزل دن میں دس بارہ دفعہ سونگھتا

ہوں اور اس کا آخری کش ایک ہی گھونٹ میں غٹاغٹ.....اب مجھے جہاز پر سفر کرنے کا بھی نشہ سا سوار ہو گیا ہے۔ آپ کو میری غربت کا واسطہ آپ میری ان الجھنوں سے چھٹکارہ دلائیں یا کسی سے ڈیزل کا پرمٹ لے دیں کیونکہ میں نے اس نشے کی خاطر اپنے بچوں کے ''جہاز'' بھی بیچ دیئے ہیں.....

ج۔ آپ کی لکھائی نے ہمیں مشکل میں ڈال دیا تھا یوں لگتا تھا جیسے ایک پَر والے جہاز میں بیٹھ کر آپ نے اپنے مسائل تحریر کئے ہیں بالآخر ایک گھڑا پینے والے نشئی سے آپ کا خط پڑھنے کیلئے مدد لی گئی ہے۔ آپ کے ڈیزل کے پرمٹ کے حصول کے سلسلے میں ایک مولانا سے درخواست کی گئی تھی لیکن پتا چلا ہے کہ اب موصوف ترقی کر کے مولانا ''ہائی آکٹین'' بن چکے ہیں لہٰذا اب تمہاری قسمت.....

باقی جہاز کی سیر کے متعلق صاف بات یہ ہے کہ تم اپنی خدمات دوسرے ضرورت مندوں کو مستعار کرو، کم از کم عمر کے اس حصے میں تو کوئی جہازی خدمت خلق کرو کیونکہ تم IN Built جہاز ہو.....

سمیرا وغیرہ۔ انک

س۔ میری والدہ کم گو ہیں چنانچہ انہوں نے پھر بھی مجھے بولنا سکھایا لیکن میں پھر بھی کم گو کی کم گو رہی اور اب میں باتونی بننا چاہتی ہوں میری تشفی فرمائیں۔

ج۔ آپ پہاڑ، پہاڑے اور راگ پہاڑی وغیرہ یاد کر لیں۔

گھمبیر گجر۔ گجرانوالہ

س۔ میں دودھ بڑے شوق سے پینا چاہتا ہوں لیکن میرے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ جب بھی میں دودھ پیتا ہوں تو میرا پیٹ خراب ہو جاتا ہے اور اگر نہ پی سکوں تو دودھ خراب ہو جاتا ہے اور اسی وجہ سے میرا موڈ بھی خراب ہو جاتا ہے براہِ کرم مشورہ سے نوازیں.....

ج۔ آپ بھینس بیچ کر گھوڑا پال لیں اور اس پر سواری کریں، ہو سکتا ہے آپ کو گھوڑی پال مربع بھی مل جائے گھوڑے کی خدمت میں لگے رہنے اور اس پر سواری کرنے سے بڑی ورزش ہو گی اور دودھ سے بھی ''سخت اشیاء'' ہضم ہونگی، اگر پھر بھی آرام نہ آئے تو گھوڑے کی لِتر پریڈ کر کے چند لمحے اس کی پچھاڑی کھڑے رہیں.....

دستر خان۔NO شہرہ

س۔ میں خواب میں ڈر جاتا ہوں حالانکہ میں بڑا بہادر قسم کا پٹھان ہوں۔ میرے لئے مشورہ تجویز فرمائیں۔

ج۔ آپ اس ترقی یافتہ دور میں بھی ڈرپوک سا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ سنیئے! جاپان نے خواب دیکھنے والی مشین ایجاد کی ہے جس سے بلیاں چوہوں کو چھوڑ کر چھچھوندروں کے خواب دیکھنے لگ گئی ہیں۔ آپ یہ مشین پشاور باڑہ سے لے سکتے ہیں۔ لوگ آئندہ فلمیں چھوڑ دیں گے اور سینما جا کر خواب ہی دیکھا کریں گے۔

(بالکل خالی صفحہ)

ج۔ میں سمجھ گئی ہوں آپ اپنے مسئلے کی وجہ سے شرما رہے ہیں اگر ٹیڑھا پن اور لنگڑا پن اور بھینگا پن دور ہو سکتا ہے تو گنجا پن کیوں دور نہیں ہو سکتا۔ بہرحال اپنے سر کو بچوں کی پہنچ سے دور رکھیں اور اس پر موم جامہ کریں۔

لاغر لاہوری۔ فیصل آباد

س۔ میرا قد لمبا ہے لیکن رنگ گہرا کالا ہے۔ اگر میں اپنا رنگ سخاوت کر کے ضرورت مندوں میں بانٹ بھی دوں تو یقین کیجئے میرا آدھا قصبہ افریقہ میں شامل ہو سکتا ہے۔ حالانکہ میں فیشل، تھریڈنگ اور سٹیمنگ باقاعدگی سے کرواتا ہوں لیکن پھر بھی لوگ مجھے کولمبو کا کالو کہتے ہیں بہرحال اس وجہ سے مجھے کبھی پریشانی نہیں ہوئی۔ میری پریشانی اس وقت شروع ہوتی ہے جب میں ٹشو پیپر اپنے منہ پر پھیر کر اسے دیکھتا ہوں۔ میں اس وقت جل کر اندر ہی اندر سے سیاہ ہو جاتا ہوں جب ٹشو پیپر کو سیاہ پاتا ہوں اور جب کہیں میں اس ٹشو سے ناک صاف کر لوں تو یوں محسوس ہوتا ہے یہ ٹشو میں نے کسی ایرانی گاڑی کے سلنسر سے نکالا ہے۔ براہِ کرم میرے اس نفسیاتی مسئلے کا حل دل سے سیاہی نکال کر بتائیں.....

ج۔ آپ کا مسئلہ اتنا مشکل اور پیچیدہ نہیں کہ اس کا حل نکالا نہ جا سکے۔ آپ نے تو ابھی میرے میاں کو نہیں دیکھا۔ خط کے آغاز سے میں یہی سمجھتی تھی کہ شاید میرے میاں بھی میرے معتقد ہو گئے ہیں اور میری صلاحیتوں کو مان کر خط لکھ رہے ہیں لیکن آخر میں آپ کا نام پڑھ کر مجھے نہایت مایوسی ہوئی ہے۔ بہرحال آپ کے مسئلے کا حل یہ ہے کہ

آپ ٹشو پیپر کی بجائے ہمیشہ کاربن پیپر استعمال کیا کریں تا کہ منہ پونچھ کر آپ کو کوئی نفسیاتی الجھن نہ ہو۔

عینی شاہد۔ ملتان

س۔ میں ایک گھریلو خاتون ہوں۔ میں آپ کو بھول کر بھی خط نہ لکھتی لیکن میری الجھنیں بڑھتی جارہی ہیں کیونکہ مجھے بھولنے کی بیماری لگ چکی ہے اس سلسلے میں میں نے ایک ہومیو ڈاکٹر سے مشورہ کیا ہے تو اس نے کہا ہے کہ اگر تم پیسے رکھ کر بھول جاتی ہو تو اس کیلئے علیحدہ دوائی ہے اور اگر روزہ رکھ کر بھول جاتی ہو تو اس کیلئے جرمنی سے قطرے منوانے پڑیں گے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر تیری والدہ تجھے کوئی کام کہے اور تو بھول جائے تو اس کیلئے Mother Tincture دن میں پانچ بار لینا پڑے گی۔ میرے ساتھ معاملہ یہ ہے کہ مجھے بیماری ایسی قسم کی ہے کہ دوائی رکھ کر بھول جاتی ہوں اور اگر وہ مل جائے تو کھانا بھول جاتی ہوں ازراہ ہمدردی میری مدد فرمایئے۔

ج۔ خدا کا شکر ادا کیجئے آپ کو بہت اچھی ''بیماری'' سے واسطہ پڑا ہے اس سے تو تمہاری بہت چاندی ہوئی ہوگی اور غموں فکروں سے نجات کا زیور ہاتھ لگا ہوگا۔ ٹیلیفون، بجلی، گیس اور دیگر کئی بل بھی آپ ادا کرنا بھول گئی ہونگی جسکی وجہ سے لازمی بچت ہوئی ہو گی۔ باقی اگر آپ کو دوسروں کے عیب غلطیں، غرور اور تکلفیں یاد رہتی ہیں اور اپنی غلطیاں غرور، اور غیبتیں بھول جاتی ہیں تو یہ کوئی نفسیاتی مرض نہیں ہے بلکہ ایک بہانہ ہے۔

بہرحال بھولنے سے پہلے میری بات یاد رکھیں ''بھولنا کام انسان کا بخشا کام رحمٰن کا''

گوگا گوٹیکری۔ گجرات

س۔ قبل ازیں آپ کو ''لیڈ'' لکھا تھا لیکن ''میڈم'' صاحبہ آپ نے اس کا کوئی Reply نہیں کیا۔ میں ایک ''ہجو کیڈ'' فیملی سے Belong کرتا ہوں اس لئے میں ''ریزرڈ'' رہتا ہوں۔ میں اس وقت بہت ڈسٹرب ہو جاتا ہوں جب لوگ بات کرتے ہوئے Mostly انگلش ورڈز Use کرتے ہیں۔ میں انہیں اسی وقت منہ پر ہی Stupid اور ''نان سینس'' کہہ کر اپنا غصہ اتار لیتا ہوں لیکن میں اس وجہ سے مسلسل الجھنوں کا شکار ہوتا جارہا ہوں You Know اور مجھے ''الارمنگ'' ہو رہی ہے کہ میں کہیں ''مینٹل ہاسپٹل'' ہی نہ پہنچ جاؤں۔ Kindly مجھے

اس الجھن سے ریلیف دلائیں.....

ج۔ اوہ جنٹلمین! شاید تمہیں ان انگریزی بولنے والے Foolish لوگوں سے اتنی نفرت نہ ہو جتنی مجھے ہے۔ میری ''ہائی سکول'' کی ایک کلاس فیلو مسرت نامی لڑکی جو کہ کشمیری انگلش بولا کرتی تھی یعنی وہ ہر جملے میں بٹ BUT کا بہت استعمال کرتی تھی۔ قدرت نے اس کو وہ سزا دی کہ تمام عمر یاد رکھے گی یعنی اس کی شادی یعنی بعد ازاں افتخار بٹ سے ہوئی۔ اب وہ دونوں ''مسرت و افتخار'' سے Life گزار رہے ہیں۔ آپ بھی کوئی پڑھی لکھی ''وائف'' ڈھونڈ لیں تا کہ پیس فل ''لائف'' گزرے انگلش بولنے والوں کے بارے میں زیادہ ''وری'' نہ کریں! See You!

(نوٹ۔ اپنی الجھنیں کاغذ کے شمال کی طرف تحریر کریں تا کہ سرد مہری کی برف پگھل سکے۔ چاول خشخاش اور گندم کے دانوں پر لکھی الجھنیں قابل اشاعت نہ ہونگی)

☆.....☆.....☆

اُلجھنیں

آج کل ہر بندہ اُلجھنوں کا شکار ہے۔ اخبارات ان اُلجھنوں کو سلجھانے کے لئے خصوصی طور پر اپنی خدمات پیش کر رہے ہیں اور ماہرین کی خدمات کو مستعار لے رہے ہیں تاکہ دوسرے اُلجھے ہوئے بھی سلجھ جائیں۔ ایک معروف میگزین کا اُلجھنوں کے حل والا صفحہ ایک معروف فلمی ہدایت کار ترتیب دے رہے ہیں اور اپنے کریکٹرا یکٹرفن سے اُلجھے ہوئے لوگوں کو فن کی بلندیوں پر پہنچا رہے ہیں۔ لیجئے! آپ بھی ان کے تجربے سے مستفید ہوں کیونکہ

دلوں کی اُلجھنیں بڑھتی رہیں گی
اگر کچھ مشورے باہم نہ ہوں گے

مسز ہری لال کالی داس۔ آف "رنگون"

س: میرے میاں نہایت شریف خاوند ہیں اس کی ایک مثال یہ ہے ان کی تنخواہ نکلوانے کے لیے میرے دستخط چلتے ہیں۔ وہ صبح سویرے اُٹھ کر دُرگا دیوی کی پوجا کرنے چلے جاتے ہیں اور مجھے ناشتہ کروانے کے بعد جا نکی دیوی کی مہابندی شروع کر دیتے ہیں۔ شام کو دفتر سے واپسی پر کالی دیوی کی پوجا پاٹ ان کا مشغلہ ہے اور رات ہوتے ہی اپسرا کے چرنوں میں ماتھا ٹیک دیتے ہیں اور رات کے آخری پہر اندرا سے بارش کی بھیک مانگتے ہیں۔ وہ کئی ورشوں سے ان کے پجاری ہیں لیکن ہمارے حالات جوں کے توں ہیں۔ اپنے قیمتی مشورے سے مستفید فرمائیں۔

ج: ہیں تو وہ پرم پجاری۔ آپ نے خود ہی سارے عندیے دے دیے ہیں لیکن یہ بڑی مایوسی کی بات ہے کہ آپ کے شوہر نے پوجا پاٹ کے لئے بھی "زنانہ" بتوں کا انتخاب کیا ہوا ہے جو کہ ان کے کردار کی پختگی کو مشکوک بنا رہا ہے۔ وہ یقینی طور پر اپنے خون پسینے کی کمائی ان کی نسوانیت کی بھینٹ چڑھا چکے ہیں۔ اگر وہ پاکستان میں ہوتے تو لکشمی کے دال چاول کھانے سے بھی گریز نہ کرتے۔ باقی دیکھنا ہوگا کہ وہ آشرم ہی جاتے ہیں یا کہیں اور۔ اس سے پہلے کہ آپ کا شوہر کوئی نیا رنگ لائے، آپ اس کے کلرفل نام یعنی ہری لال کالی داس کی کلر سکیم سے

ایک آدھ رنگ کو صاف کرنے کی کوشش کریں اور بغیر انتظار کئے ابتدائی طور پر ان کا رنگ ہی اُڑا دیں۔ اس کے بعد میں آپ کو یہاں سے تین حرف بھیجوں گا جو ابتدائی طبی امداد کے طور پر آپ کے لیے فائدہ مند ہوگی۔

دختر نیک اختر۔لندن

س: ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہم میاں بیوی آپس میں ویسے تو بہت محبت کرتے ہیں لیکن ہمارا روزمرہ کا جھگڑا بڑھتے بڑھتے طلاق تک جا پہنچتا ہے اور پھر ہم خاندان کے بیچ بچاؤ کی وجہ سے صلح کر لیتے ہیں، ہمیں ایسے مشورے سے نوازیں کہ کم از کم ہمارا جھگڑا طلاق تک نہ پہنچے۔

ج: چشم بددود! واقعی آپ کا جوڑا "صلح جُو" ہے جو بالآخر راضی نامے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ لہٰذا آپ دونوں مل کر ایک ایسا جوڑا بھی سلوالیں جس پر کوئی ضرب وغیرہ اثر نہ کرے۔ میرا خیال ہے کہ اگر آپ ایک دوسرے کو قتل بھی کر دیں تو بات صلح پر ہی ختم ہوگی۔ آپ کے خاندان والے آپ کے حقیقی پرستار ہیں اور وہ آپ کے ہر ڈراپ سین سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں۔ آپ انہیں مسکرانے کے خوشگوار مواقع فراہم کرتے رہیں تاکہ وہ آخری حربے کے طور پر آپ کے کام آسکیں۔ میں سمجھنے سے قاصر ہوں کہ آپ طلاق سے اتنی خوفزدہ کیوں ہیں، یہ تو یورپ کی محض ایک Give and Take والی اصولی سے بات ہے بلکہ شادی کا بونس شیئر ہے۔

پرویز خان پردیسی۔وزیرستان

س: پرویز مشرف میرے لیڈر ہیں چونکہ وہ میرے ہم نام بھی ہیں اس لیے مجھے ان سے بڑا لگاؤ ہے۔ مجھے اپنے مشورے سے نوازیں کہ ان کو سیاست میں کیسے لایا جاسکتا ہے۔

ج: بھائی بات یہ ہے کہ پوری دنیا میں سیاسی حالات کی جنس تبدیل ہو رہی ہے اور پرویز مشرف بھی اسی کا حصہ بن کر پاکستان سے بجلی کی طرح غائب ہو چکے ہیں باقی کچھ پرویز تو یہیں ہیں اور صرف مشرف کو یہاں لاکر آپ کے شوق کی تکمیل ہو سکتی ہے یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ لانے اور بلانے میں فرق ہے۔ لہٰذا اب انہیں سیاست میں لانا تو درکنار پاکستان لانا بھی مشکل ہو گیا ہے۔ ہاں الطاف بھائی چاہیں تو اپنے بھیا کو بہلا پھسلا کر یہاں بھیج سکتے ہیں۔ ویسے مجھے تمہاری سیاست کی سمجھ آ گئی ہے تم اسے پاکستان بلا کر دوبارہ کوئی تماشہ شروع کرنا چاہتے ہو' باقی سوالات اگلے شمارے میں۔

☆.....☆.....☆

اُلجھنیں (2)

س۔ اشرف بے گھر۔ لاہور

میں بے گھر ہوں۔ وزیراعظم کی سکیم سے دو تین مرلے کا گھر حاصل کرنے کا کوئی طریقہ بتا دیں۔

ج۔ بھئی آپ نے ثابت کیا اور نہ لکھا ہے کہ آپ واقعی غریب ہیں۔ بے گھر تو محض آپ کا تخلص ہے اگر آپ کو گھر دئے بھی دیا جائے تو پھر بھی ''بے گھر'' ہی رہیں گے۔ لہٰذا پارٹی کا اصول ہے کہ اگر کسی غریب کے پاس رہنے کو گھر نہیں ہے تو اسے اپنے دائرے میں رہنا چاہئے اور اگر وہ بھی میسر نہ ہو تو پھر اسے کم از کم قانون کے دائرے میں رہنا ہوگا تا کہ نظام حکومت بغیر کسی رکاوٹ اور ملاوٹ کے چلتا رہے۔

سردار صدر سنگھ سوڈا۔ کانپور

س۔ مجھے ایک نفسیاتی مسئلہ ہے میں خود کو صدر کا کان تصور کرتا ہوں حالانکہ میں ایک مکمل انسان ہونے کا دعوے دار ہوں۔ برائے مہربانی میرے وہم کا علاج تحریر فرمائیں۔

ج۔ آپ نے یہ تحریر نہیں کیا کہ آپ کس ملک کے صدر کی بات کر رہے ہیں البتہ آپ کا مرض واقعی تکلیف دہ ہے۔ اگر آپ اپنے بھارتی صدر کی بات کر رہے ہیں تو وہ ایک عورت ہے اور اس کے جھمکے یقیناً آپ کو تکلیف دے رہے ہوں گے حالانکہ یہ بھی کہا جاتا کان پڑے جھمکے کبھی تکلیف نہیں دیتے۔ مگر یہ کان پڑی تکلیف کسی دوست پر ظاہر نہ کریں کہ کہیں وہ اس وجہ سے آپ کو ''کانا'' پکارنا شروع نہ کر دیں حالانکہ آپ کی آنکھیں سلامت ہیں۔ مجھے آپ کی تکلیف کا بہت احساس ہے اس لئے اس کا جامع حل ضروری ہے۔ اگر آپ خود کو کسی صدر کا ہاتھ یا بازو تصور کرتے تو شاید آپ کو اس قدر ذہنی اذیت سے نہ گزرنا پڑتا بھلے یہ ''دایاں بازو'' ہی ہوتا چنانچہ آپ مایا کو کر کر لمبے ہاتھ بلکہ آڑے ہاتھوں لیتے۔ آپ کا مسئلہ گھمبیر ہونے کے باوجود آپ کے صدر کو اس بیماری کی کانوں کان خبر نہیں۔ ہاں اگر آپ اپنے آپ کو کسی کی آنکھ تصور کرتے تو اس تکلیف سے آنکھ چرائی جا سکتی تھی یا آنکھیں لڑا کر معاملہ دبایا جا سکتا تھا۔ اس

کی بجائے آپ اپنے آپ کو کسی کی ناک تصور کر لیتے تو صرف عینک کا معمولی بوجھ یا پھر موسمی زکام آپ کے آڑے آتا۔ وہ بھی اس وقت جب صدر صاحب کسی کو ناک بھوں چڑھاتے یا وہ کان کسی عطائی سے صاف کرواتے۔ اوہ بھائی! مجھے یاد آیا کہ آپ کا تو اپنا نام صدر سنگھ ہے اسی لئے آپ کو دوہری تکلیف ہے ویسے وہم کا علاج تو ہمارے صدر کے پاس بھی نہیں۔

ق قصوری۔ راولپنڈی

میں ایک لا۔ گریجویٹ ہوں لیکن پیشے کے اعتبار سے صحافی ہوں۔ میرے ساتھ، کرائے کے گھر میں ایک وکیل راؤ صاحب رہتے ہیں جنہوں نے جرنلزم کیا ہوا ہے لیکن حالیہ واقعے کی وجہ سے وہ بات بات پر مجھ سے الجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ ہر وقت محلے میں اپنی قانونی طبیعت کی وجہ سے ''راؤ Law'' بنے رہتے ہیں اور اپنے آپ کو قانون کا ''گوری Law'' سمجھتے ہیں۔ آج انہوں نے مجھے گھر سے باہر پانی بھی چھڑکنے نہیں دیا۔ بتائیں میں کیا کروں۔

ج: جناب والا! ملک میں پہلے ہی پانی کی اشد کمی ہے لہٰذا پانی کا چھڑکاؤ اور راؤ صاحب کا گھیراؤ کرنے سے اجتناب کریں اور اس پانی کے چھڑکاؤ پر فی الحال مٹی ڈال دیں۔ کہیں یہ نہ ہو کہ وہ کسی ذمہ داری سے آنکھیں ''چرانے'' کی وجہ سے آپ کو چوروں کی صف میں کھڑا کر دیں لہٰذا آجکل ''فاص Law'' رکھنا ضروری ہے۔

مجاہد بلوچ۔ گوادر بلوچستان

س: بحیثیت محبِ وطن پاکستانی مجھے یہ بتائیں کہ قوم کو جلد از جلد متحد کیسے کیا جا سکتا ہے۔

ج: قوم کو متحد کرنا بہت آسان ہے۔ آپ نے کچھ عرصہ پہلے پٹرول پمپ مالکان کی ہڑتال دیکھی ہو گی جنہوں نے نہایت کامیابی سے اس کو انجام دیا۔ اس بات کو مدِ نظر رکھ کر اگر عوام کو ایک ایک پٹرول پمپ دے دیا جائے اور نور یز شکور کو دوبارہ پٹرولیم کا وزیر بنا دیا جائے تو وہ ہمیشہ کے لیے متحد ہو سکتی ہے پھر آپ خود کہیں گے کہ صرف ان تلوں میں تیل ہے اور اس کے بعد دنیا تیل اور تیل کی دھار دیکھے گی۔ پھر بھلے دنیا کہتی رہے کہ ''پڑھیں فارسی بیچیں تیل دیکھو قدرت کے کھیل۔''

☆.....☆.....☆

''بھول چال''

برمنگھم برطانیہ سے خبر ہے کہ وہاں یاداشت کا ایک مقابلہ منعقد کیا گیا جس میں لوگوں کی کثیر تعداد نے بغیر بھولے شرکت کی۔ جیتنے والوں نے یاداشت کے حیرت انگیز ریکارڈ قائم کیے اور لوگوں کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا۔ مقابلے میں شریک لوگوں نے دو وصد مختلف اشیا پر مشتمل فہرست کو صرف ایک منٹ میں ذہن نشین کر کے وہاں پر موجود حاضرین کو بغیر غلطی کیے سنا دیا۔ ایسی یاداشت واقعی خدا کی عطا ہے اور اس پر جتنا بھی فخر کیا جائے کم ہے لیکن، ہوا یہ، کہ مقابلے کے اختتام پر شرکاء مقابلہ اپنی بیشتر اشیاء وہیں بھول گئے اور بلا آخر ''کھلکھلا'' کا القاب لیکر واپس لوٹے۔ اس سے معلوم ہوا کہ بھولنے کا عمل صرف غیر ذمہ داری سے ہوتا ہے۔ ایک سردار جی نے سکھوں کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے کہا تھا کہ ان میں دو خوبیاں ہوتی ہیں ایک ان کی یاداشت اور دوسری؟ میں یاد کر کے بتاتا ہوں۔ بھولنے کی بیماری کو نسیان کہتے ہیں اور انسان کا لفظ بھی اسی نسیان سے نکلا ہے یعنی یہ ہر بات بھول جاتا سوائے مالی معاملات کے۔ اسے دماغ کی خرابی نہیں کہا جاسکتا لیکن دماغی فتور ضرور کہا جاسکتا ہے اس لئے یہ بیماری برائے خواری ہے۔

ویسے بھول جانے کی عادت عورتوں میں زیادہ ہوتی ہے اور مردوں میں یاد رکھنے کی کم اس لئے دونوں ہی اس بیماری کا شکار پائے گئے ہیں خصوصاً اگر عورت کوئی بات بھول جائے تو اسے فراموShe'' کہتے ہیں اور اگر مرد ایسا کرے تو اسے ''He لا باز'' یا بھول چال کہہ سکتے ہیں لیکن بھول کا بھی کوئی اصول ہونا چاہئے اور چال کا بھی۔ نسیان میں تنخواہ ملنے کی تاریخ تو یاد ہوتی ہے لیکن قرض کی ادائیگی یاد نہیں ہوتی۔ تاریخ سے یاد آیا بھولنے کا مرض بربادی کی ابتدا ہے اگر آپ کسی عمارت کے کھنڈر کے پاس کھڑے ہوں تو سمجھ لیں کہ یہ کسی کی ''بھول'' کا نتیجہ ہے۔ ویسے شادی کے بعد ہر چیز بھول جاتی ہے اور آٹے دال کا بھاؤ یاد رہ جاتا ہے۔ میرے ایک شادی شدہ دوست کو اس بیماری نے گھیر رکھا ہے لیکن کبھی کبھی وہ اس کا گھیرا توڑ کر ایسے نکلتا ہے کہ لوگوں کو بھول ہونے لگتی ہے شاید اس بیماری کی وجہ سے یہ نو بچوں کے باپ ہیں۔ ان میں سے کسی بچے کو چوٹ لگنے کے بعد، جب یہ جلدی سے ہسپتال کی طرف تو دو گیارہ ہوتے ہیں تو

انہیں یہ پتا نہیں ہوتا کہ وہ دو بچے گھر بھول چکے ہیں۔ اپنی بیماری سے تنگ یہ صاحب اپنے بچوں کو یہ تلقین کرتا ہے کہ اس بھولنے کی بیماری کو کبھی بھول کر بھی نظر انداز نہ کرنا لیکن بچے لوگ پھر بھی بھول جاتے ہیں، اسے کہتے ہیں بھول چوک لیتی دیتی۔ ان بچوں کا یہ حال ہے کہ انہیں اسہال لگے ہوں تو وہ ڈاکٹر کو یہ بھی نہیں بتا سکتے کہ کل سے آج تک کا سکور کتنا ہے لیکن قدرت کے خاص کرم کی وجہ سے یہ "اس حال" میں بھی گیسٹرو سے بچ جاتے ہیں۔ کبھی بھولے بھٹکے اپنی اس بیماری کی دواء لے بھی آئیں تو اسے لینا بھول جاتے ہیں۔

لیڈر یادگاریں اس لیے بناتے ہیں کہ قومیں اپنی تاریخ نہ بھولیں لیکن قوم کو صرف کیپٹی نکلنے کی تاریخ ہی یاد ہو تو لیڈر کیا کرے۔ قدرت نے انسان کو بڑی اچھی تقویم سے بنایا ہے لیکن اس میں بھولنے کا مرض بھی بطور خاص رکھا ہے ورنہ وہ کسی عزیز کی موت کو بھول پاتا اور نہ نقصان اور جدائی وغیرہ کو۔ یعنی بھول جانا ایک نعمت بھی ہے بشرطیکہ بڑھ کر Dementia کی شکل اختیار نہ کر جائے۔ یہ انسان ہی ہے جو بھولتا ہے کسی دوسری مخلوق کو کبھی بھولتے نہیں دیکھا۔ دنیا کے بڑے بڑے لیڈر بھی اس بیماری کا شکار پائے گئے ہیں۔ ہٹلر خودکشی سے پہلے یہ بھول گیا تھا کہ ابھی یہودیوں کا انبار زندہ ہے۔ عراق اور افغانستان میں پراؤ بش کی بھول تھی لیکن اوباما کو بھی بھولے شام ہو چکی ہے۔ کاش ہماری قوم بنگلہ دیش کی علیحدگی یاد رکھتی۔ میری اس غزل کے چند اشعار سے اندازہ لگائیں کہ مجھے کیا خطرات لاحق ہیں ۔

سفر کے شوق میں تھا فاصلہ ہی بھول گیا
عجیب سحر تھا میں راستہ ہی بھول گیا

بنایا سجدوں سے جب ایک گوہر نایاب
حریم کعبہ سے تب واسطہ ہی بھول گیا

کسی کی دید کا کچھ ایسا لرزہ طاری تھا
کہ احترام کا ہر قاعدہ ہی بھول گیا

کہا تھا ساقی نے احمد کہ آج شام آنا
جو شام آئی تو میں میکدہ ہی بھول گیا

☆.....☆.....☆

سٹہ ایکسچینج اور.....

یہودی ذہن روزِ ازل سے نقتہ اور مال وزر کا بے تاج بادشاہ ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ دولت انسان کی چھٹی حس کو بیدار رکھنے میں معاون ثابت ہوتی ہے اور بقیہ پانچ کی جوانی کو بھی چار چاند لگائے رکھتی ہے۔ زمانہ قدیم سے یہود عالمی مالیات کی نبض پر انگلیاں رکھے ہوئے ہیں۔ وہ ایسا کیوں نہ کریں، ان کا سارا سرمایہ، سوسائٹی اور سلطنت ہر وقت انتہائی نگہداشت وارڈ میں پڑی رہتی ہے۔ سٹاک ایکسچینج بھی اسی کی ایجاد ہے جسے ہر ملک کی معاشی نبض بھی کہا جاتا ہے۔ نبض کی بھی ایک چال ہوتی ہے اور یہودی اس سلسلے میں کوئی نہ کوئی چال چلتے رہتے ہیں اور عالمی دھڑکنوں کو کم زیادہ کرتے رہتے ہیں تاکہ کوئی نہ کوئی دھڑکا لگا رہے۔

یہودی اپنی ٹیکنالوجی اور پھر کارٹل کے ذریعے لوہے کو سونے کے بھاؤ بیچ رہے ہیں اور انکی خوب چاندی ہو رہی ہے۔ میرے خیال میں بے جا تنقید برائے عمل ہے اور بالکل نہ کرنا اس سے بھی برا ہے پھر زمانے کو برا بھلا کہنے کا کیا فائدہ۔ ایک کہاوت ہے کہ تمام معاشرہ ہی غلط تو پھر تمام ٹھیک ہی ہوتا ہے یہاں ایک واقعہ ذہن میں آرہا ہے۔ ایک گاؤں میں ایک مال دار یہودی نے ایک بڑی جگہ کرائے پر لی۔ اس گاؤں میں بندر بھی بہت زیادہ تھے۔ اس شخص نے اپنے منشی کو کہا کہ گاؤں میں منادی کرادو کہ جو بندر پکڑ کر لائے گا اسے فی بندر سو روپے نقد انعام دیا جائے گا۔ گاؤں والوں نے دھڑا دھڑ بندر لانے شروع کر دیئے۔ بندروں کے سائز، عمر اور ساخت پر کوئی پابندی رکھی گئی اور نہ جنس پر، یعنی ہر ماڈل قابل قبول تھا۔ منشی بندروں کو خرید کر ایک بڑے ٹینٹ میں بند کرتا گیا۔ چنانچہ سارا گاؤں ملے جلے بندروں سے خالی ہو چکا تھا اور سارا سٹاک یہودی کے 100 انڈیکس میں شامل ہو چکا تھا۔

بذریعہ منشی، اب یہودی نے ''کمیشن درکار ہیں'' کا ایک نیا اعلان کروایا کہ جو بندر پکڑ کر لائے اسے فی دانہ پانچ صد روپے دیا جائے گا۔ اس کاروبار میں فوری منافع دیکھ کر کئی بروکر اور کمیشن ایجنٹ بھی گاؤں آ گئے اور یہودی نے انہیں کرائے پر جگہ دینا شروع کر دی۔ اس طرح یہودی کی زمین پر کئی دکانیں اور ہوٹل کھل گئے اور چند دنوں میں بیرونی سرمایہ بھی آنے لگا۔

جب یہودی کے پاس گرد و نواح کے تمام بندر جمع ہونا شروع ہو گئے تو لازمی بات ہے بندروں کی بلیک مارکیٹنگ شروع ہو گئی۔ چنانچہ یہودی نے ایک نیا ریٹ نکالا اور یہ اعلان کروایا کہ اب جو بیوپاری بندروں کی لاٹ لیکر آئے گا اسے دو ہزار روپے فی بندر دیا جائے گا۔

نیا پرکشش ریٹ سن کر بروکروں کی بے ایمانی اس حد تک پہنچ گئی کہ انہوں نے سوچنا شروع کر دیا کیوں نہ اس سپلائی میں ملتے جلتے چہروں والے انسانوں کو بھی ری کنڈیشن کر کے لاٹ کا حصہ بنا دیا جائے۔ چنانچہ جب اوپن مارکیٹ میں بندر بالکل شارٹ ہو گئے تو یہودی کے ایک پارٹنر نے بروکروں کو بلا کر کہا کہ ہو سکتا ہے کہ آئندہ چند روز میں ایک پیس تین گنا ریٹ پر بھی نہ ملے گا لہٰذا اس کے شوروم سے فی دانہ تین ہزار میں دستیاب ہے۔ اس خبر کو مدِ نظر رکھتے ہوئے بروکروں اور ایجنٹوں نے پہلی فرصت میں اس کا شوروم خالی کر دیا اور سارا مال اٹھا لیا۔

اب یہودی نے اپنے منشی کو بلایا اور نیا اعلان کیا کہ کل صبح پانچ ہزار روپے فی دانہ کے حساب سے خریداری عمل میں لائی جائے گی۔ یہ کیا خوبصورت وقت تھا جب گاؤں میں کاروباری سرگرمیاں عروج پر تھیں پیروزگاری کا خاتمہ ہو چکا تھا اور گراس روٹ لیول سے ترقی کا عمل شروع ہو چکا تھا گاؤں میں سٹے کا یہ کاروبار سولہ ہزار کی حد عبور کر چکا تھا۔ گاؤں کے لوگوں نے اپنے اثاثے بیچ کر موبائل، موزر اور موٹر سائیکلیں خرید لی تھیں مگر اگلی صبح یہ معصوم ''شیئر ہولڈرز'' بندروں کو بغل میں دبائے یہ صدائیں بلند کر رہے تھے کہ ہمارے گاؤں کو کس کی نظر لگ گئی کون اغوا کر کے لے گیا ہمارے ان اکانومسٹ بروکروں اور بڑے سیٹھ کو.....!

محترم قارئین! آنے والے وقت میں ان گاؤں والوں سے اور کتنے ہاتھ ہوں گے یہ کہنا ابھی قبل از وقت ہے۔ ان گاؤں والوں کے لئے اب بھائی چارہ قائم کرنا کون سا مشکل کام رہ گیا ہے اور بھائی بھائی بننا کتنا آسان ہو گیا ہے کہ پہلے کبھی نہ تھا کیونکہ ان کی سوچ ایک، اپروچ ایک، حرکات ایک جیسی اور مشکلات ایک جیسی، عزائم ایک سے، عذاب ایک سے، طلب و رسد ہم آہنگ اور حسد کا بھی یہی رنگ۔ لہٰذا معاشرے کے ان حالات اور ہم آہنگی میں ہر نئے بچے کی پیدائش پر مرثیہ لکھنا چاہئے نہ کہ رحلت پر.....!!

☆.....☆.....☆

تراش خراش

پکاسو سے کسی نے پوچھا تھا کہ تم اتنا اچھا مجسمہ کیسے بنا لیتے ہو؟ وہ عاجز مزاج شخص کہنے لگا کہ میں ایک بڑا سا پتھر لیتا ہوں، پھر اس میں سے زائد پتھر تراش کر علیحدہ کر دیتا ہوں، دریں اثناء اس تراش پر تھوڑی سی مزید خراش کر کے نیا مجسمہ نکال لیتا ہوں۔ پکاسو کی بات سے اس نتیجہ پر پہنچا جا سکتا ہے کہ اگر انسان صرف تراش خراش کا ماہر ہو تو وہ انسانی تہذیب کا ڈیزائن تک بدل سکتا ہے۔ اس کے برعکس "تراش خراش" کے ہنر سے نابلد انسان، سمع خراشی کے ساتھ ساتھ، ذہن خراشی کا مرتکب بھی پایا جاتا ہے۔ یہاں ایک اور ستم ظریفی کا انداز ہ بھی ہوتا ہے کہ کسی پتھر سے زائد پتھر ہٹانے والا شخص ہنرمند مجسمہ ساز کہلاتا ہے لیکن اس کے برعکس چھوٹے چھوٹے پتھروں کو جوڑ کر عمارت بنانے والا شخص محض مستری کہلاتا ہے۔ اس لئے اُلٹے کام کرنے والے کو معاشرہ ویسے بھی سیدھی طرح عزت نہیں دیتا۔ لیکن کیا کیا جائے، جس طرح انسانوں کو اکثر ایک ہی طرح کی بیماریاں لگتی ہیں اسی طرح معاشرتی بیماریاں بھی تقریباً تھوڑے بہت فرق سے ہی فروغ پذیر ہوتی ہیں۔ مثلاً Chaos کی جو بیماریاں اسلام آباد سے پھیلتی ہیں اس کے جڑواں فیصل آباد اور حیدرآباد میں بھی کثرت سے ملتے ہیں۔ اس بیماری کی ایک قسم پبلک لیٹرینوں میں تحریر وتصویر کشی ہے کچھ اسی وجہ سے ہمارے واش روم "اوباش" روم لگتے ہیں اور اس آلودگی سے تھانوں، ایوانوں اور کارخانوں میں باتھ روم بھی محفوظ نہیں۔ پال گڈمین کے بقول All men are creative but few are artist یعنی کچھ لوگ صرف بناتے ہیں اور کچھ مہارت سے بناتے ہیں۔

پوری دنیا میں لوگ اپنا غبار نکالنے کے لیے تقریر، تحریر یا تصویر کا سہارا لیتے ہیں اور سڑکوں پر Graffiti کے ذریعے اپنی حاجت کو رفع کرتے ہیں لیکن کمزور دل حضرات اپنا نہی قصہ بیت الخلاء میں تمام کرتے ہیں۔ ان کے آرٹ کے نمونے دیکھ کر دوسرے کمزور حضرات اپنا سامنہ لیکر یہاں سے باہر آ جاتے ہیں۔ ایک وقت تھا جب انسان اپنے کھانے، ٹھکانے لگانے کے لیے کھلی جگہوں کا رخ کرتے تھے جہاں Sitting سے پہلے Setting کرنا پڑتی تھی پھر

وقت نے ذرا کروٹ بدلی۔ انسائیکلو پیڈیا کے مطابق دنیا کی پہلی جدید Lavatory سر جان ہرنگٹن نے 1596ء میں ملکہ الزبتھ اول کے لئے بنائی تھی حالانکہ واش روم کا وجود زمانہ قدیم میں ہڑپہ سے بھی ملتا ہے لہٰذا اس ایجاد پر اُسے ''سر'' کا خطاب دینے کی بات سمجھ سے بالا ہے۔ دوسری طرف ایک برطانوی خاتون نے یورپ کے تمام باتھ رومز کے اس تحریری اور تصویری آرٹ کو جمع کر کے اس پر ایک مقالہ تحریر کیا تو اسے، اس لیٹریچر پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری دیدی گئی۔ ان باتوں کو مدنظر رکھ کر اسی ٹاپک پر یہ تحریر لکھ رہا ہوں اور اس کے باعث دو دن سے کھانا بھی نہیں کھایا دیکھیں اب مجھے کیا اعزاز ملتا ہے۔

جب بھی کسی شریر النفس شخص کو اپنے کسی آرٹ پر طبع آزمائی کی حاجت ہوتی ہے تو وہ سب سے پہلے ''ان'' کا رخ کرتا ہے اور وہ اپنا دماغی مواد اپنی دست کاری سے ان کے در و دیوار پر منعکس بلکہ منقش کرتا ہے۔ دریں اثناء وہ کم از کم وقت میں ایسی تصویر زنی کرتا ہے کہ کوئی شریف النفس اس کو آہنی جامہ بھی زیب تن نہیں کروا سکتا۔ یہاں کی فضا کو مزید خراب کرنے کا سہرا بھی اس حاجت باز کے دماغ کی ڈسپوزل پر ہوتا ہے جو خالی جگہ پُر کرنے کے فینمپٹن ہوتے ہیں۔ جیسے ہی آپ اس بیت الخلائی ''گیلری'' کے اندر داخل ہوں آپ کو یوں محسوس ہوگا کہ آپ پتھر کے دور میں دھکیل دیے گئے ہیں، پھر یہاں پرویز مشرف پہلے شخص ہیں جو اپنے سنہری دور سمیت یاد آتے ہیں۔ یہاں آپ کی نظر زیادہ تر اوپر، یعنی چھت والی ڈرائنگ پر ہی رہے گی کہ کہیں یہ کریش ہو کر اوپر ہی نہ آ رہے یا عقب والے کارٹون کی ٹانگ بے قابو ہو کر فلائنگ کِک ہی نہ بن جائے، جو یہاں کی سوچوں بھری فضا مزید خراب کر دے۔ جس طرح انگریزی عالمی زبان کہلاتی ہے اسی طرح یہاں سے ملنے والا تھری ڈی آرٹ پوری دنیا میں بغیر ناک پر کپڑا رکھے سمجھا اور جانا جاتا ہے۔ اگر شیطانی آرٹ کا پرچار صرف یہیں مقصود ہے تو حکومت کو چاہئے کہ وہ Latrine نما آرٹ گیلریاں بنانے پر بھی غور کرے تا کہ اس قسم کے آرٹ کو ایک خاص جگہ پر ''ریڈ لائٹ'' کیا جا سکے اور سارے ملک کو ''آرٹ کالج'' بننے سے بچایا جا سکے۔

☆.....☆.....☆

قے قہے

ہر سال مئی میں ہنسنے ہنسانے کا عالمی دن منایا جاتا ہے لیکن جس جملے میں ''May'' لگا دیا جائے اس میں شک کے ذرّات داخل ہو جاتے ہیں مگر یہاں مشکل یہ ہے کہ اسے انگریزی سال سے کیسے نکالا جائے۔ بہرحال! یورپ والے بطور خاص اس دن کو منانے کا اہتمام کرتے ہیں اور مناتے مناتے رات ڈال دیتے ہیں جیسے ہمارے ہاں کرکٹ کا ''ون Day'' رات کو کھیلا جاتا ہے۔ حضرات قہقہہ لگانے کے لیے کسی خاص مرہم کی ضرورت نہیں ہوا کرتی اور چمکتے دانتوں کی بالکل بھی نہیں، اس ''فیچ'' کام کے لیے گندے دانتوں سے زیادہ صاف ستھرا کام لیا جا سکتا ہے بلکہ جتنے یہ زیادہ گندے ہوں گے اتنا دوسروں کو تفریح کا ''صاف'' موقع ملے گا اور مزید قہقہے بھی میسر آ جائیں گے۔

ایک لحاظ سے یہ خبر خوش آئند ہے کہ دنیا اس نازک دور میں بھی قہقہے دار دن منانے کا ارادہ رکھتی ہے حالانکہ انہیں اُسامہ کے متعلق کوئی خوشخبری مل سکی ہے اور نہ ہی اسامہ کی جگہ کوئی نئی ''اُسامی''۔ آپ ذرا ''USA-MA'' کے سپیلنگ پر غور فرمائیں۔ کیا اب بھی شک کی گنجائش ہے۔ لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ یورپی لوگ قہقہوں کے مقابلوں میں شرکت کر کے اس کا بھرپور عملی مظاہرہ کرتے ہیں۔ مقابلے ختم ہوتے ہی اگلے مقابلوں کی تیاری شروع کر دی جاتی ہے اور لگے لگائے قہقہوں کو سٹور کرنے کا یہ سلسلہ پورا سال خوش اسلوبی سے چلتا ہے۔ ہماری حکومت کی بھی یہ ''سنجیدہ'' کوشش ہونی چاہئے کہ جہاں وہ غیروں سے اتنے قرضے حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے وہاں اگر وہ قہقہوں کی گرانٹ لینے میں کامیاب ہو جائے تو لوگ دونوں گرانٹوں کو ''ہنسی خوشی'' استعمال کر سکیں گے اور قوم بغیر کوئی مقابلہ منعقد کئے ''ہنس کھیل'' سکے گی لیکن بدقسمتی سے ہمارے ہاں ہنسی اور ہنس راج دونوں ہی ناپید ہوتے جا رہے ہیں۔ ہماری قوم میں ویسے تو ہر قسم کا ٹیلنٹ اور خوبیاں موجود ہیں!! یہ بے چاری اتنی لطیف الطبع ہے کہ ذرا دیر کے لیے بجلی آنے پر خوشیاں منانے لگ جاتی ہے۔ اس قوم کی معمولی سی خواہش صرف یہ ہے کہ وہ کسی طرح 10 بائی بارہ واٹ بجلی کو فریم کروا کر رکھ لے تا کہ لوڈ شیڈنگ کے اس ''روشن'' دور میں World Smile Day میں شادمانی سے شرکت کر سکے اور وہاں کوئی

یا اور خوش گوار ریکارڈ بنا سکے ورنہ ہمارا صرف تماشہ بنے گا، ریکارڈ نہیں..... یہ بھی المیہ ہے کہ قہقہے اور خوشیاں دو کانوں یا دانتوں کے ڈاکٹروں سے نہیں ملا کرتیں۔ یہ اتنے غیر ذمہ دار ڈاکٹر ہوتے ہیں کہ یہ نئے دانت تو لگا دیتے ہیں لیکن مسکرانے کی گارنٹی نہیں دیتے اور اگر کسی دکان دار سے اس بارے میں دریافت کریں تو وہ خوش الحانی سے کہے گا کہ قہقہے لو گے؟ یا ہوش کے ناخن..... ایک سردار جی ان ہی مقابلوں میں شرکت کے لیے ٹرین کا سفر کر رہے تھے کہ اسی دوران ان کو پیٹ کی خرابی کی شکایت ہوئی۔ قبل ازیں انکی پریشانی میں اضافہ اسی وقت ہو گیا تھا جب ان کو اوپر والی سیٹ الاٹ کی گئی تھی کیونکہ وہ پچھلے سفر میں ایک جھٹکے کی وجہ سے اوپر سے تلے آ چکے تھے۔ یہ تکلیف دہ ماجرا انہوں نے اپنے ایک دوست کو سنایا۔ دوست نے پوچھا سردار جی آپ نے نیچے والے مسافر سے سیٹ کیوں نہ بدلی؟ کیسے بدل لیتا، نیچے تھا ہی کوئی نہیں! سردار جی نے باچھیں کھول کر کہا..... ہمارے بھی ایک خرم نامی کوچ نے ان مقابلوں کے لیے ٹیم تیار کی اور چائنہ سے درآمد کردہ جدید قسم کی ''گدگدیاں'' ساتھ لیکر یورپ روانہ ہوئے ظاہر ہے پرانی گدگدیاں کہاں کام آتی ہیں۔ واپسی پر خرم سے پوچھا گیا کہ تمہاری ٹیم نے مقابلوں میں کیا مقام حاصل کیا؟ کہنے لگا ''رونے کا مقام'' آئندہ سال اس سے ٹیم کی دوبارہ تیاری کی درخواست کی گئی تو اس نے ہنس کر ٹال دیا ہے حالانکہ اس دفعہ کچھ قسمت کے مارے افراد بھی اس میں سلیکٹ ہو چکے تھے اور ان کے کپتان نعیم بخاری کے بنائے جانے کا امکان تھا حالانکہ ہمارے ملک میں ہتھیار، قاہ قاہ اور داؤ لگانے پر سارا سال Adhoc لگتی رہتی ہے۔ اگر کوئی سرعام قہقہہ ''لگائے'' تو اس کا قہقہہ بحق سرکار ضبط ہونے کا خدشہ ہوتا ہے۔ سوائے نعیم بخاری کے جو بڑی خوش خطی سے قہقہہ لگاتے ہیں، بچپن میں تو وہ اس بات پر زور دیتے تھے کہ ''وہ'' مجھ پر ہنستا ہے۔ اس وقت ان میں ہنس کر برداشت کرنے کی عادت نہیں تھی۔ آج کل عدالتی مسائل پر ہنس ہنس کر ان کی ہنسلی کی ہڈی ٹوٹ چکی ہے اور پیٹ میں بل پڑ چکے ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ ان کے پاس ہنسی کے بہت سے نسخے ہیں لیکن اب پتہ چلا ہے کہ وہ نسخے نہیں ''نقصے'' ہیں جو کار آمد نسخوں میں سے نقص نکالنے پر پیدا ہوتے ہیں۔ کئی دفعہ وہ بات تو کیا منہ سے باتوں کا بتنگڑ چھین لیتے ہیں اور پوچھنے پر بل بھی پڑتے ہیں۔ یہ بات بھی ہم سے کہ کئی لوگ ایسے افسردہ منش ہوتے ہیں کہ ان کو ہنسانے کے لیے کوئی منتر، منطق اور مصرعہ اثر نہیں کر پاتا۔ ان لوگوں کی عادتیں اتنی بگڑ چکی ہیں کہ اگر انہیں چک شہزاد میں قرضوں کے ساتھ قہقہے بھی دے دیئے جائیں تو وہ پھر بھی مسرور نہیں ہوں گے اور اس کو ہنسی میں اڑا دیں گے۔ ناجائز

دولت بھی ان کا مذاق اڑاتے ہوئے یہ شعر کہتی ہے:

جن کے ہونٹوں پہ ہنسی پاؤں میں چھالے ہونگے
ہاں وہی لوگ مجھے ڈھونڈنے والے ہونگے

پرویز مشرف کے دور میں مسائل، موبائل اور میزائل اکٹھے آنے کے ساتھ SMS بھی آنا شروع ہوئے اور قوم کو حکمرانوں کے بیانات اور SMS سے لطف اندوز ہونے کا اکٹھا موقع ملا لیکن میزائلوں نے سارا مزہ کرکرا کر دیا۔ ہاں اگر میزائلوں کے ساتھ امریکا کے ویزے بھی آ جاتے تو چند لوگوں پر خوشیاں بھی ٹوٹ پڑتیں۔

محترم خوش مزاج قارئین! اگر واقعی قہقہوں پر پابندی لگ جائے تو ڈاکٹر محمد یونس بٹ، عطاء الحق قاسمی، گل نوخیز اختر، اشفاق احمد ورک، مشتاق احمد یوسفی، جاوید اقبال (کارٹونسٹ)، عبداللہ طارق سہیل اور انعام الحق جاوید وغیرہ کو اپنی ''ظرافت'' قبل از گرفتاری کروانا پڑے گی جس کی کوئی ضمانت بھی نہیں دی جا سکتی۔ ضیاء الحق قاسمی مرحوم نے تو اپنی جیب سے ''ظرافت'' کا اجراء کر کے قہقہوں کو فروغ دینے کی ازحد کوشش کی۔ مرحوم مزاح کی ترویج مزاح ہی کے ذریعے کرنے میں کوشاں رہے نہ کہ کسی ''اوز'' ذریعے سے۔ وہ مزاح کے اجزائے ترکیبی بدلنے کے قائل تھے تاکہ اسی میں جدت پیدا ہو۔ وہ شاعروں کی طرح ''مزاح فاتی'' درجہ بندی کے قائل نہ تھے۔ وہ صرف جاندار سطور کو اہمیت دیتے تھے۔ وہ کون کہہ رہا ہے کی بجائے کیا کہہ رہا ہے کہ داعی تھے۔ ویسے ادب میں نقاد کی اہمیت ادبی آڈٹ آفیسر کی طرح ہوتی ہے جو کہ صرف پیرا بنانے پر عمل پیرا ہوتا ہے۔ لیکن پولیس کا اپنے ہی تھانے پر حملہ خوش کن نہیں ہوتا.....

ایک مغربی مفکر کہتا ہے کہ لطیفے! سننے والوں کے لیے مزاح اور سوچنے والوں کے لیے اداسیاں چھوڑتے ہیں۔ اپنی خوشیوں اور غموں کا سامنا خود ہی زیرتبسم کرنا پڑتا ہے۔ کوئی دوسرا شاذونادر ہی اس میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ اگر ایسے ممکن ہو تو مائیکل شوماکر کار ریس کے لیے ڈرائیور نہ رکھ لیتا..... جو شخص اپنی ذات کا مطالعہ جاری رکھتا ہے وہ خوش بھی رہتا ہے اور کامیاب بھی۔ کامیابی کے بارے میں ایک مفکر کہتا ہے کہ کسی کی بائیوگرافی پڑھ کر کامیاب انسان بننے کی تمنا رکھنا ایسے ہی ہے جیسے کھانے کی ترکیبیں پڑھ کر بیکری کھول لینا..... خوش رہنا اور خوش رکھنا ایک اچھے خاوند کے لیے ہی ضروری نہیں بلکہ ایک اچھی..... لیکن ہمیں بائبل مقدس کے اس عظیم سبق کو بھی یاد رکھنا ہوگا کہ قہقہے خوشیوں میں کمی کا باعث ہوتے ہیں.....

☆.....☆.....☆

جو بندھ گیا وہ موتی

بڑھاپے میں انسان کوئی نہ کوئی جسمانی کمزوری محسوس کرتا ہے آج کل ایک نام اپنے کانپتے ہاتھوں اور لرزتی ٹانگوں کے ساتھ سامنے آتا ہے لیکن پھر بھی یہ کسی تعارف کا محتاج نہیں..... یہ شخصیت ادبی بھی ہے اور لیگی بھی۔ اس لئے ہر نئی جنم لینے والی مسلم لیگ کے عقیقے میں باادب شامل ہو جاتے ہیں لیکن بدقسمتی سے پرانے مسلم لیگی ان کی سرمنڈائی کر کے پیچھے ہٹا دیتے ہیں اور نیا شو چلا دیتے ہیں یعنی میزبان طارق عزیز شو، یہ شوخت ہو تو فوراً شوکت عزیز سامنے آتے ہیں۔ شوکت عزیز کے جانے کے بعد لیگی دوڑ ہاتھ ملتے رہ گئے ہیں کیونکہ ان کے ہاتھ لنگوٹی لگ سکی اور نہ روٹی، یقیناً اب عوام کو روٹی کے لیے اپنی لنگوٹی خود ہی کسنا پڑے گی۔ ملک اغیار سے ہمیشہ اپنے بندے کو یہاں سے بھاگنے کی ٹریننگ پہلے دے دی جاتی ہے جس کا مقصد اول لنگوٹی کا بچاؤ ہی ہوتا ہے اور ہمارے عوام کو اپنی آنکھوں کے بچاؤ کا جس میں سابق حکمران مرچیں ڈال کر فرار ہوتے ہیں۔ ایک وقت تھا جب شوکت عزیز اور طارق عزیز لنگوٹیا ہوا کرتے تھے اور انہوں نے پورے ملک کو ہی نیلام گھر بنانے کا عزم کیا ہوا تھا۔ سٹیل ملز کی مشق کے بعد ہر ادارہ ان کے سامنے ''سوت کی انٹی اور یوسف کی خریداری'' ثابت ہو رہا تھا۔ اس وقت ادارہ قومی بچت کی بچت کے امکانات بھی معدوم ہو گئے تھے۔ بالآخر یہ ثابت ہوا کہ لوہا کسی کو راس آتا ہے۔ طارق عزیز نون لیگ سے اپنا سنگل تڑوا کر بھاگے حالانکہ وہ اپنے لوگوں کو آہنی جال میں رکھتے ہیں یا پھر آہنی ہاتھوں سے نمٹتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ نون لیگ کی اپنوں کے علاوہ عوام پر بھی بہت نوازشات رہی ہیں۔ پرویز مشرف بھی ان کی نوازش سے آگے آئے اور بڑھتے بڑھتے براستہ کارگل، قائد کوہ قاف لیگ بن گئے۔

طارق عزیز کا نیلام عام بچپن منٹگمری میں گزرا۔ ان دنوں یہ بہت پھونک پھونک کر قدم رکھا کرتے تھے اس لئے پہلا قدم جوانی میں ہی رکھا اور ابھی تک کوشش یہی ہے کہ یہاں سے قدم باہر نہ پڑے ادھر یہیں پھونک نکلے، لہٰذا اب تک ''جواں سالی'' ہی میں قدم گاڑھ رکھے ہیں۔ منٹگمری شہر اپنی جیل کی وجہ سے آباد ہوا۔ اس وجہ سے اس شہر کے کئی علاقے اب بھی ''چکی''

کا منظر پیش کرتے ہیں لہٰذا اب یہ منٹگمری سے ساہیوال اور ساہیوال سے بھاہیوال بن چکا ہے۔ وہاں لڑائی میں یہ بڑی جواں مردی سے بزدلی دکھا کر بھاگا کرتے تھے حالانکہ بزدل پیٹھ دکھا کر بھاگا کرتے ہیں..... اور یہ ضرب المثل ان کی زبان پر ہوتی تھی:

ہو جس کے ہاتھ میں ڈنڈا
مت کیجو اس سے پنگا

بقول موصوف کے، ان دنوں جب یہ انگڑائی لیا کرتے تھے تو ساتھ کھڑے نوجوان کی جوانی پر زخم لگا دیا کرتے تھے لیکن اب یہ ایسا کر بیٹھیں تو خود کدھر پڑے ہوتے ہیں اور انگڑائی کدھر..... اسی عالم شباب میں دوران دھینگا مشتی ان کا مخالف کسی وجہ سے گر گیا۔ یہاں موقع تھا کہ یہ اسے تین چار ٹانگیں رسید کر کے اپنا ریکارڈ بہتر کر لیتے لیکن انہوں نے یہ موقع بھی ہاتھ اور ٹانگوں سے گنوا دیا اور پھر اپنی ٹانگ بچا کر بھاگ رہے..... ساہیوال سے ''رہا'' ہو کر سیدھے لاہور پہنچے۔ جس کرب سے یہ اپنا واقعہ سناتے ہیں اس سے معلوم یہی ہوتا ہے کہ شاید وہ کرائے کے سائیکل پر منٹگمری سے لاہور آئے یہ ان دنوں خزاں اور خزانے کے لفظی فرق سے ناآشنا تھے اور محفل کو مئے غل لکھا کرتے تھے یہ تو اس وقت کو ابھی بھی اچھا کہتے ہیں جب چوراہا کو چوواہا پڑھا کرتے تھے۔ ضرب المثل ''چوراہے کی ہنڈیا چوراہے میں پھوٹتی ہے'' بیان فرمایا کرتے تھے۔ لاہور آ کر سب سے پہلے مولوی عبدالحق کے خانسامے سے اپنی اردو کا انجن اوور ہال کروایا اب یہ اپنی اردو سے لوگوں کو پڑھنے ڈال دیتے ہیں۔ زمانہ طالب علمی میں انہیں انگریزی کا لازمی پرچہ بھی دینا پڑتا اور جب یہ پرچہ دے کر گھر لوٹتے تو یہ گمان ہوتا کہ ان کے والد صاحب نے ان کیخلاف پرچہ درج کروا کر تفتیش شروع کی ہوئی ہے اور پھر حکم ہوتا کہ اسے فوراً اندر کر دو کیونکہ باہر بہت گرمی ہے۔ پھر بھی انہیں والد کے ہاتھوں اتنی مار نہیں پڑی جتنی انگریزی کے ہاتھوں۔ یہ انگریزی کو فرنگ ریزی قرار دیتے ہوئے انگریزی کے پرچے کو بھی اپنی اردو ہی سے مزین کرتے تھے اور ان کے استاد ان کے جذبہ قومیت کی قدر کرتے ہوئے ان کی انگریزی کا اردو سے حساب بے باک کر دیتے تھے۔ آج کل یہ انگریزی کے کسی بھی لفظ کا اپنے ''حساب'' سے ترجمہ کرتے ہیں اور اگلا قدم اٹھاتے ہیں ایک دفعہ ان کی بیگم نے ان سے پوچھا کیا آپ دفتر سے ''Late'' آئیں گے۔ چنانچہ یہ غصے سے دفتر میں ہی لیٹ رہے۔ بچپن میں ایک بھینس ان کی ملک تھی پھر بھی اس کے Milk سے فائدہ نہ اٹھا سکے کچھ اسی وجہ سے اپنے دوستوں سے ماڈل ٹاؤن، گارڈن ٹاؤن اور ڈی ایچ اے سوسائٹی وغیرہ بھی ملنے نہیں جاتے۔

ایک دفعہ اُن کے ہمسائے بے باک بٹ نے فون پر یہ درخواست کی کہ اس کی بیل نہیں ہو رہی لہٰذا کوئی انتظام کریں۔ یہ اپنے ساتھ فوراً ایک مالی کو لے کر اس کے ہاں پہنچے بعد میں معلوم ہوا کہ بیباک بٹ تو عدالت سے Bail کروانے کی بات کر رہے تھے۔ بہرحال موصوف پھر بھی انہیں بات باور کرانے میں کامیاب ہو گئے کہ پودوں کے سلسلے میں یہ بندہ کام کا ہے چنانچہ کچھ دنوں بعد جب ان کے اسی ہمسائے نے ان سے منی پلانٹ خراب ہونے کی شکایت کی تو ان سے شدید ناراض ہوئے..... کسی نے پوچھا کہ منہ اندھیرے گھر سے نکلتے ہیں اور منہ اندھیرے ہی لوٹتے ہیں؟ جواب ملا لوڈشیڈنگ! جیسا کہ پیچھے ذکر ہوا تھا کسی زمانے میں، دوران، ہاتھا پائی یہ اپنے جوتے دوستوں کو سونپ کر دوڑ لگا دیا کرتے تھے لیکن آج جیسے ہی بجلی جاتی ہے تو ان کے جسم میں بجلی دوڑ جاتی ہے پھر یہ ماضی میں جتنے بھی ''پرویز'' گزرے ہیں ان کو خیالوں میں لا کر پنجابی میں شعلہ بیانی سے بھرپور خطاب کرتے ہیں۔ اگر اس کی زد میں خواجہ پرویز جیسا شاعر بھی آئے تو کانوں میں انگلیاں ٹھونس لے۔ جنرل ضیاء الحق کے دور ہی سے انہیں ''ضیاء بیطس'' ہو چکی ہے۔ اب میٹھی بات سے بھی اجتناب کرتے ہیں اور احتیاط پسند اتنے ہو چکے ہیں کہ گاڑی میں شوگر فری پٹرول کے بارے میں دریافت کرتے ہیں بلکہ کوشش ہوتی ہے کہ گاڑی کے ٹائروں پر بھی احتیاطاً موزے چڑھا دیں۔

قومی مسائل کے حل کے لیے قومی لباس پہن کر کمر کس چکے ہیں۔ یہ کہتے ہیں ''ارادہ کیجئے کام لیجئے'' ہمارے ہاں دستور ہے کہ ''بندھ گیا سو موتی رہ گیا سو پتھر'' طارق عزیز اس مالا کا حصہ ہیں جو اس میں بندھ گیا وہ یقیناً بندہ بن گیا.....

☆.....☆.....☆

تصحیحات

خطا ہونا اور خطا کھانا انسان کی فطرت میں شامل ہے لیکن خطا کاری ایک اختیاری امر ہے جس کی گریہ وزاری کے بغیر معافی نہیں۔ اداکارہ میرا کی ایک خطا منظر عام پر آچکی ہے۔ عالمی منظر نامے میں ایک اداکارہ کے لئے نکاح، نقائص میں شمار کیا جاتا ہے لہٰذا اب محسوس ہوتا ہے اب کوئی پاکستانی اداکارہ ایسی گھناؤنی خطا نہیں کرے گی۔ ایک وقت تھا جب رسل و رسائل کی کتابت خطاط کے ہاتھوں ہوا کرتی تھی لیکن وہ کتابت کرتے ہوئے بہت کم خطائیں کیا کرتا تھا اور زیادہ سے زیادہ زیر کو زبر کی جگہ ''پیش'' کرنے کی غلطی کیا کرتا تھا۔ اگر وہ کسی وجہ سے نیند میں ہوتا تو اونگھتے ہوئے اس کی زیر، زبر ہو جایا کرتی تھی، جو دِکھانے اور دُکھانے کا کام کیا کرتی تھی۔ اگلے دن وہ اپنی زبریں ہاتھ میں لئے مدیر اعلیٰ کے سامنے ''پیش'' ہوتا جو اس کو وہیں پر ''زیر'' کرنے کی ''شدومد'' سے کام لیا کرتے تھے اور اسے مُجرم سے محرم بنانے کی تلقین کیا کرتے۔ وہاں سے پلٹتے ہوئے اس قلمکار میں اتنی طاقت نہیں ہوتی تھی کہ وہ غلطی سے ڈالا گیا اپنا نقطہ بھی اٹھا سکے۔ اب کمپوزنگ کا دور آچکا ہے، جہاں کام پہلے سے قدرے آسان ہو گیا ہے وہاں ایک انگلی، غلط لگنے کی وجہ سے پیروں کے پیرے بدل جاتے ہیں۔ الفاظ میمنہ سے میسرہ اور میسرہ سے میمنہ کی طرف دھکیل دیے جاتے ہیں اور اس وجہ سے خبریں، اشعار، اشتہار، محاورے اور ضرب المثل کی غلطیاں اکثر منظر عام پر آتی رہتی ہیں اور شعر میں بندوں کی بجائے بندروں کو تول دیا جاتا ہے۔ کمپوزر حضرات رسید کرنے اور رسید دینے، بے باک ہونے اور حساب بے باق ہونے یا، دم کرنے اور ناک میں دم کرنے کی غلطی کو خاطر میں نہیں لاتے۔ اخبارات اس سلسلے میں تصحیحات، تردیدات اور معذرت بھی شائع کرتے رہتے ہیں لیکن بعض اوقات غلط خبر بھی اصل سے زیادہ تفریح دیتی ہے۔ ایک ایسی ہی خبر تھی کہ ''رن پٹھانی پل کا کام تمام ہو گیا کل ٹریفک کے لئے کھول دیا جائے گا'' مگر اتفاق سے وہ پل دوبارہ ریلوے ٹریفک کے لئے نہ کھل سکا تھا اور اخبار کو مجاوراتی غلطی کی اصلاح بھی نہ کرنا پڑی۔ ایک دفعہ ایک ایسی

ہی غلطی سے سچ کا گمان بھی ہوا تھا، تصحیح شدہ خبر تھی ''کونڈا لیزا رائس نے ویت نام کا کامیاب دورہ کیا'' جو ایک دن پہلے ''ویت نا کام'' چھپ گیا تھا۔ مارچ میں ایک خبر سے یوں خبردار کیا گیا تھا کہ ''دارالحکومت میں وردی کا زور ٹوٹنے لگا''

قارئین! وہ وردی نہیں سردی تھی لیکن قارئین نے غلطی بھری خبر کو درست قرار دے دیا۔ ایک اخبار نے تو یہ معذرت بھی چھاپی جائے کہ کل کے میگزین میں شائع ہونے والے لطیفے میں فوجی کی جگہ سویلین کی تصحیح کر لی جائے۔

کئی حکمران اتنے سیاست دان بن جاتے ہیں کہ وہ انٹرویو کے لیے تین تردیدوں کی گنجائش بھی حاصل کر لیتے ہیں۔ بعض اوقات اخبارات ایسی تصاویر بھی شائع کر دیتے ہیں کہ قارئین کو گراں گزرتی ہیں مثلاً ایک شائع ہونے والی تصویر کے نیچے یہ Caption دی گئی تھی۔

''مولانا اپنی گاڑی میں ڈیزل بھرواتے ہوئے'' کیا باقی گاڑیوں میں ڈیزل کی بجائے لسی استعمال ہونے لگی ہے؟

اخبارات میں کئی خبریں ایسی ہوتی ہیں کہ انہیں پڑھ کر ویسے ہی حیرانی ہوتی ہے۔ مثلاً ''حج سے واپسی پر اداکارہ نرگس پرنوٹ نچھاور کیے گئے'' لیجئے! وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ ایک خبر تھی ''چور خاموشی سے گھر کا سونا غائب کرنے میں کامیاب''

قارئین چور کو پتا ہوگا کہ خاموشی ہی سونا ہوتی ہے۔ خبر تھی ''بجٹ میں عورتوں کی فلاش کے لئے کروڑوں روپے مختص'' قارئین! یہ فلاح ہے فلاش نہیں۔ ایک حکیم شکایت کر رہے تھے کہ ان کے اشتہار میں جوارش جالینوس کی جگہ جوارش ''جعلی نوس'' شائع کر کے پیسے پورے لے لئے اور ان کے مضمون

مولی کے فوائد کی بجائے مولوی کے فوائد شائع کر دیا۔

قارئین! اگر کل یہ خبر شائع ہو کہ ''ملک کے آبی وسائل کی کمی کو ''بلیک واٹر'' سے پورا کرنے کے عملی اقدامات کی ہدایت'' تو کون غیر ذمے دار ہوگا جو اس ہدایت کی کسی سے شکایت کرے گا۔ اگر یہ خبر آئے تو اس کی تصحیح بھی ضروری نہیں ہوگی۔

☆.....☆.....☆

دھینگا مشتی

لڑائی شروع کرنے سے پہلے کسی اہتمام کی ضرورت نہیں ہوتی چنانچہ یہ بڑی آسانی سے شروع ہو کر روانی سے جاری رہتی ہے۔ ہمارے ہاں کسی جھگڑے کی افزائش لئے کوئی مواد، موسم یا محل وقوع درکار نہیں ہوتا۔ اکثر اوقات اس کا آغاز، منہ زوری، معصومیت، مغالطے اور مبالغے کے باعث بھی ہو جاتا ہے اور اگر اس کا آغاز ہو جائے اور ساتھ مُکا بھی چل جائے تو کوئی بعید نہیں کہ اس کے واسطے مُخبیق، موزر اور مورچہ بھی درکار ہو۔ ویسے تالی ہمیشہ دو ہاتھوں سے بجتی ہے اگر کہیں یہ ایک ہاتھ سے بج رہی ہو تو سمجھ لیں اس میں کوئی خفیہ ہاتھ کارفرما ہے اور سب سے پہلے اس کے ساتھ دو دو ہاتھ کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اکثر جھگڑے کا آغاز مذاق سے شروع ہوتا جو بعد میں دوسروں کے لئے مذاق بن جاتا ہے اور پھر یہ جھگڑا، جارحیت، جگ ہنسائی، جبڑا ٹوٹنے اور جلاوطنی کا پیش خیمہ بھی بن جاتا ہے۔ جھگڑالو!!! جملے کا ایک لفظ آگے پیچھے کرنے سے بھی دھینگا مشتی شروع کر دیتے ہیں۔ مثلاً کیا حال ہے؟ خیریت ہے؟ اگر وہ آگے سے یہ کہہ دے کہ ''خواریت ہے'' بس لیجئے! معاملہ اس خفیہ ہاتھ کے ہاتھ لگ گیا جس کے ہاتھوں کی لمبائی پہلے ہی مشہور ہے۔ جنگل میں جھگڑے کا منگل اس بات سے شروع ہو سکتا ہے کہ بے چاری ''بھیڑ'' اس بات پر اصرار کرے کہ سب کو صرف سبزہ ہی کھانا چاہئے اور ''بھیڑیا'' اس سے بالکل مختلف رائے رکھے تو بندر پر لازم ہے کہ وہ بیچ میں آ کر خاطر خواہ فائدہ اٹھانے میں دیر مت کرے تاکہ ان کی مُڈبھیڑ کو ''لگام'' مل سکے۔ ہمارے ہاں لڑائی کا آغاز بڑا مضحکہ خیز اور انجام عبرت انگیز ہوتا ہے۔ بعض اوقات بٹیروں کی لڑائی کی وجہ سے شروع ہونے والی لڑائی بٹیروں کے گھونسلوں تک پھیل جاتی ہے اور مرغوں کی لڑائی کا آخری راؤنڈ اور سٹریٹ فائٹ کا انجام کورٹ سٹریٹ تک جا پہنچتا ہے اور پھر صلح کے لئے ایک نئی ''Fight back'' کرنا پڑتی ہے۔ بصد اوقات لوگ مفت مال لیتے ہوئے لڑائی ''مول'' لیتے پائے گئے ہیں اور کئی دفعہ کنگھی سے شروع ہونے والے جھگڑے میں ایک دوسرے کو مار مار کر گنجا بھی کر دیا جاتا ہے لیکن یہ بات

بھی ذہن میں رہے کہ جھگڑا چھوٹے لوگ کرتے ہیں اور ان کے درمیان راضی نامے کے لئے بڑے ہی میدان مارتے ہیں۔ ویسے ہر امن پسند نے بینجمن کا اصول اپنا رکھا ہے وہ کہتا ہے کہ

Never complain and never explain

ایک عام انسان جسے ڈاکٹر لڑائی کے لئے فٹ قرار دے دیں وہ لڑائی کی طرف کم ہی آتا ہے۔ میرا دوست رانا کریم جسے ہمارے کالج کے دور سے رانا کریمنل کہا جاتا ہے بچوں کی نوک جھونک کی وجہ سے لڑائی مار کٹائی کے لئے ہر لمحہ تیار رہتا ہے حالانکہ اس کا کام میں اس کی فٹنس کا یہ عالم ہے کہ نظر کمزور ہونے کی وجہ سے دوڑ نہیں سکتا لیکن یہ کام نظر دوڑا کر پورا کر لیتا ہے۔ اگر وہ میدان کارزار میں پوری طرح نظر دوڑا بیٹھے تو اس کا سانس قابو میں نہیں رہتا۔ لڑائی کے بارے میں اس کا موقف بڑا واضح اور اصولی ہے کہ کوئی میرے ساتھ جھگڑا کرے تو میں اسے غنڈہ گردی قرار دیتا ہوں اور اگر میں خود کسی کے ساتھ الجھ جاؤں تو یہ میری جوانمردی ہے۔ اس کو کئی دفعہ مشورہ دیا گیا ہے کہ نظر کو منظر سے صرف پھیر لیا کرو لیکن وہ اس مشورے کو نظر انداز نہ کرے تو رانا کریمنل کیسے کہلائے۔ ویسے بچوں کی ہاتھا پائی کی وجہ سے لڑنے والے بھی بچے ہی ہوتے ہیں چاہے ان کے دانت لڑائی کی بجائے عمر رسیدگی کی وجہ سے گر چکے ہوں۔

بقول ہمارے بزرگ شاعر اور لکھاری ظفر اقبال۔

مسائل بڑھ گئے ہیں گفتگو ہونا ضروری ہے
ہمارا آپ کا اب روبرو ہونا ضروری ہے

لیکن آج کل کے حالات کے مطابق اس شعر میں یہ ترمیم کرنا بھی ضروری ہے۔

مسائل بڑھ گئے ہیں دوبدو ہونا ضروری ہے
ہمارا آپ کا اب جنگجو ہونا ضروری ہے

ان جھگڑوں کے خاتمے کے لئے ہمیں سب سے پہلے خود سے دھینگا مشتی کرنا ہوگی اور وہ بھی ایسی کہ تماشائی اسے بڑھ بڑھ کر دیکھتے ہوئے خود الجھ بیٹھیں۔

☆.....☆.....☆

اصل قصائی

آج کل دوکاندار کے روبرو ہونا کون سا آسان ہے۔ وہ ہو بھی قصاب کے جو گاہک کا مغز کھانے والا بھی ہو۔ جس انداز سے اس نے ہاتھ میں چھری سنبھال رکھی ہوتی ہے اس سے بالکل برعکس اس نے ہوش سنبھالا ہوتا ہے۔ یہ دل ''شکنی'' میں ماہر گنا جاتا ہے۔ اور ماہر تو یہ ''قیمو تھراپی'' کا بھی ہوتا ہے اس لئے بُری زبان کے استعمال سے کبھی دریغ نہیں کرتا اور چند لمحوں میں گاہک کا پتا پانی کر دیتا ہے۔ آپ کے علم میں یہ بات ضرور ہو گی کہ قصاب سے ''دل پسند'' گوشت حاصل کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ اس کے لئے بڑے دل گردے کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ وہ ذرا سی بات پر کلیجے کو پڑتا ہے، اس لئے اس کے جگری یار بھی شاذونادر ہی ہوا کرتے ہیں۔

میرے دوست وقار مجروح کی مجبوری یہ ہے کہ وہ بکرے کے گوشت کا دل دادہ ہے اور اس کے گھر والے مچھلی کے۔ اس لئے اس کی کوشش ہوتی ہے، کیوں نہ گوشت ہی مچھلی والا حاصل کر لیا جائے۔ اگر اسے کسی دن گوشت میسر نہ آئے تو یہ اوجڑی سے ہی ''دل'' بہلا لیتا ہے میرے اس دوست کے بارے میں مشہور ہے کہ یہ بڑا گوشت کھاتا ہے حالانکہ یہ الزام برائے الزام ہے کیونکہ کھاتا بکرے کا ہی ہے۔ لہٰذا قصاب سے ہر اعضا کی قیمت پہلے طے کر لینا چاہئے ورنہ بعد میں بہت بڑی قیمت چکانا پڑتی ہے۔ کوئی دکھی انسانیت کا خدمت کا دعویدار قصاب تو گاہک کی کھال اتارنے کا قصد بھی الٹی چھری سے کرتا ہے اور اس کی کوشش ہوتی ہے کہ وقار مجروح جیسا فرمائشی گاہک اس کی چھری تلے ذرا دم لے ورنہ اس کا اپنا دم ٹوٹتا دکھائی دیتا ہے۔ انسان کی فطرت ہے کہ یہ اسی کا دم بھرتا ہے جس میں نگوئی دم خم ہو۔ وقار مجروح کی بیوی سے جب پوچھا جائے کہ آپ کے شوہر کہاں تشریف لے گئے ہیں تو وہ فرماتی ہیں کہ ''خدا بخشے'' گوشت لینے گئے تھے۔ اس بے چاری کا یہ حال ہے کہ مرغ بانگ دے تو دوپٹہ سر پر رکھ لیتی ہے۔

ہمارے علاقے میں قربان قصاب ہی "پائے" کا قصائی ہے۔ اس کے بارے میں مشہور ہے کہ اس کی آنکھوں پر خاصی چربی ہے حالانکہ یہ خالص گوشت پوست کا انسان ہے۔ دراصل اس کی ایک آنکھ سفید پتھر کی اور دل سیاہ پتھر کا ہے۔ لوگوں کو خطرہ ہوتا ہے کہ وہ اس سے گوشت مول لیتے کہیں بیر مول نہ لے بیٹھیں۔ اس سے گردن کا گوشت مانگو تو یہ دُم ہلاتا ہے اس سے سری مانگو تو یہ "سریع" الحرکت ہو جاتا ہے۔ اس سے کبھی ران کا تقاضا کر لیں تو یہ بہانہ کرتا ہے کہ یہ ران رانے کی ہے اور یہ ٹُھ ایک پٹھان رکھوا گیا ہے۔ سینے کا گوشت مانگو تو سینہ زوری کرتا ہے۔ ہمیں گوشت کیسا بھی درکار ہو الٹی آنتیں گلے پڑنے کا خدشہ موجود رہتا ہے۔ قربانی تو فقط مسلمان کرتے ہیں اور عید صرف "قربان" مناتا ہے۔ عید قربان پر یہ جتنے جانور حلال کرتا ہے اسی بنا پر دعویٰ کرتا ہے کہ "حلال" کمائی صرف میری ہے۔ ایک دفعہ حفیظ ہوشیار پوری نے اپنی نواسے کو املا لکھاتے ہوئے لفظ "حلال" لکھنے کو کہا۔

اس نے جواباً پوچھا کہ "ہ" کون سی حفیظ والی یا ہوشیار پور والی؟ مجال ہے کہ قربان قصاب میں ذرا نزاکت نظر آئے لیکن اس کا بڑا بیٹا نزاکت ہر وقت ساتھ نظر آتا ہے۔ اس میں ایک اور خرابی ہے کہ یہ کند ذہن ہے اور خوبی یہ ہے کند چھری استعمال نہیں کرتا۔ صبح ہی سے جانور مارنے شروع کر دیتا ہے اور رات ہوتے ہی خراٹے۔ جب کبھی قربان قصاب جیسا شخص کہے کہ میرا دل خون کے آنسو رو رہا ہے تو سمجھ لیں کہ حالات واقعی خراب ہیں۔ ہمارے ہاں ہر اس شخص کو قصائی کہہ دیا جاتا ہے جو کہ گوشت کا کام کرتا ہے اصل میں قصائی ایسے ہی بدنام ہیں۔ دراصل قصائی وہ ہوتا ہے جس کے بغل میں چھری ہوتی ہے۔ کسی کے نام کے ساتھ قصاب لگانے سے وہ ظالم نہیں بن جاتا اور ہٹانے سے وہ رحمدل نہیں ہو جاتا۔ ہمارے ہاں انسانیت کی خدمت کا دعویٰ کرنے والے کئی پیشہ ور لوگ قصائیوں سے بھی بڑی چھریاں لے کر بیٹھے ہیں اور عوام کو "ذبح" کر رہے ہیں اور یہ دہشت گرد قصائیوں سے بھی بڑی برادری کے طور پر منظر عام پر آ چکے ہیں جو حقیقت میں عوام کی ہڈی پسلی ایک کر رہے ہیں۔ ہمارے عوام ان سے اچھی طرح واقف ہیں انہیں معلوم ہے کہ اصل قصائی کون ہے؟

☆.....☆.....☆

''سُرخواب'' کے پَر

یہ خوابوں کا دور ہے اور ہر کوئی، کوئی نہ کوئی خواب دیکھنے پر مجبور ہے۔ لیکن یہ امر بھی خوش آئند ہے کہ جاپانی سائنسدانوں نے ایک ایسی مشین ایجاد کر لی ہے جس سے من پسند خواب دیکھے جاسکتے ہیں۔ شاید جاپان کو اس مشین کی مارکیٹ میں فروخت کے لئے گاہکوں کو سبز باغ یا سبز خواب کے ٹریلر بھی دکھانا پڑیں۔ کمپنی کے مطابق خواب دیکھنے کے لیے اس مشین میں پہلے صرف ایک تصویر ڈالنا پڑے گی۔

لیجئے! اب ڈالر بھی شارٹ ہونے کو ہیں کیونکہ اس کی تصویر ہمیشہ محبوب تصور کی جاتی ہے۔ تصویر کے متعلق ایک فرانسیسی فلم ڈائریکٹر کہتا ہے کہ اگر تصویر سچی ہوتی ہے تو پھر سینما سولہ عدد فی سیکنڈ سچا ہے۔ اگر خوابوں کی اس مشین میں اِدھر اُدھر کی تصویریں ڈالی گئیں تو پھر یہ نہ بھولئے گا کہ پولیس کا ہے فرض ''مدد'' آپ کی۔ گاہکوں نے اس مشین کا نام تھری۔ ڈی یعنی ڈریم ڈسپلینگ ڈیموکریسی (خوابی جمہوریت) رکھ دیا ہے۔

اپنے آغاز میں یہ مشین آواز کے بغیر ہوگی جیسے کسی زمانے خاموش فلمیں ہوا کرتی تھیں اس لئے وہ آج بھی گولڈن کہلاتی ہیں۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ مشین لفظ خواب کے واؤ کی طرح ہمیشہ خاموش ہی رہے۔ کمپنی کا کہنا ہے کہ اس مشین کے ساتھ ایک کنخواب بھی فری ملے گا۔ اگر کسی کمپنی نے نیند Cum خواب والی ڈبل مشین ایجاد کر لی تو وہ آمدنی کی وجہ سے اپنے ملازمین کی نیندیں بھی اڑا سکتی ہے۔

ایک مغربی مفکر کے بقول خواب میں کئے گئے اچھے کاموں کی تعبیر بھی اچھی ہوتی ہے۔ اس لئے یورپ کے لوگ اپنے ہر علاقے کے لئے اچھے اچھے خواب دیکھا کرتے ہیں لیکن ہمارے حصے میں ہمیشہ Nightmare ہی آتے ہیں چنانچہ اسی لئے پاکستان میں میئر کا عہدہ ہی ختم کر دیا گیا ہے۔ یہ بھی ''دیکھا'' گیا ہے کہ خوبصورت خواب چند منٹوں میں جان کی بازی ہار دیتا ہے اور ڈراؤنا خواب جب تک آنکھ نہ کھلے وہ کھل کھڑا کرتا ہے۔ انگریز اس لئے اسے ڈر۔یم کہتے ہیں۔ یہ بھی کتنی بدقسمتی ہے کہ: ''ایک خواب ڈراؤنا اور اوپر سے میں ڈرپوک۔'' لوگ ڈراؤنا خواب دیکھ کر بہت واویلا کرتے ہیں لیکن اچھا خواب دیکھ کر خاموشی

سے ڈکار جاتے ہیں۔ بڑے لوگ اپنے لیے بڑی بڑی خواب گاہیں تعمیر کرنے کے لئے بڑی جدوجہد کرتے ہیں لیکن انہیں اپنی نیند سونے کے لئے اس سے بھی زیادہ جدوجہد کرنا پڑتی ہے۔ کئی لوگوں کی نیند ایسے اُڑ چکی ہوتی ہے کہ وہ نیند کے بھی صرف خواب ہی دیکھا کرتے ہیں اور دن میں خواب دیکھنے کے سب سے زیادہ طریقے بھی یہی لوگ جانتے ہیں۔

جاپانی کمپنی نے یہ گارنٹی بھی دی ہے اگر کوئی انسان اس مشین کا خواب دیکھتے دیکھتے سو جائے گا تو وہ خواب کے درمیان اپنے حصے کا قدرتی خواب دیکھنے کا اضافی Benefit بھی لے سکے گا اور اب یہ مثال بھی پرانی ہو جائے گی کہ خواب کے درمیان خواب کوئی شاعر ہی دیکھ سکتا ہے۔ چنانچہ اب لوگ خیالوں کی بجائے خوابوں کی دنیا میں رہتے پائے جائیں گے۔ صاف ستھرا خواب دیکھنے کے خواہش مند، دولت مند کو اس بات پر رضامند بھی کیا جاسکتا ہے کہ وہ اپنی اس مشین کو واشنگ مشین کے ساتھ جوڑ لے۔ اگر آپ خواب دیکھ کر اسے بھلانا چاہیں تو واشنگ مشین میں ذرا سا بریزن واشنگ پوڈر ڈال لیں۔

اگر کوئی گرما گرم خوابوں کا متمنی ہے تو وہ اس کی تار کو تندور میں ڈال کر اس خواب کو حقیقت بنا سکے گا۔ شاید اپنے حسین خوابوں کو موبائل میں محفوظ کرنے والی بھی کوئی مشین آ جائے اور ان میں سے کئی اچھے خواب بعد میں ریلیز بھی ہو سکیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی ادارہ ڈریم بینک بھی بنا دے۔ لیکن اس مشین کے زیادہ سے زیادہ استعمال کے ذریعے ہم دن اور رات کو ایک کرنے والا مشکل کام بھی آسانی سے کر سکتے ہیں۔ خواب، عقاب اور آفتاب کو کبھی کھلی آنکھ سے نہیں دیکھنا چاہئے۔ یہ اتنا ہی مشکل ہے جیسے کسی اندھے کے لئے کسی دوسرے اندھے کو سات رنگوں کا فرق سمجھانا۔ اس مشین کی یہ خوبی بھی ہوگی کہ اچھا خواب قسطوں میں بھی دیکھا جا سکے گا اور ادھورے خواب سے نجات ملے گی جس کے پاس مشین ہوگی تو سمجھ لیں اس کو سُرخاب کے پر لگ گئے ہیں۔ یہ مشین شاید اتنی مہنگی ہو کہ کسی غریب کے لئے یہ دیوانے کا خواب ثابت ہو اور وہ صرف اس کا خواب ہی دیکھ سکے۔ جاپان نے یہ مشین بنالی ہے اور میں ابھی تک یہ پروگرام نہیں بنا سکا کہ اس کے استعمال سے کون کونسا خواب دیکھنا ہے۔ چلو ترقی کے نہ سہی لیکن اس مشین کے ذریعے خواب دیکھنے کا حق ہر پاکستانی کو ہے اور اُسے چاہئے کہ وہ اس مشین کو دیکھ بھال کر خریدے کیونکہ المیہ یہ ہے کہ

یہ مشین بجلی سے چلے گی!!!

☆.....☆.....☆

''تالاب حیات''

سگریٹ نوش معاشرے کا کیسا ستم زدہ شخص ہوتا ہے کہ بے چارے کو کسی سگریٹ فیکٹری میں جا کر بھی یہ درخواست کرنا پڑتی ہے کہ ''کیا میں یہاں سگریٹ پی سکتا ہوں'' سگریٹ نوشی کسی بھی صاحب حیثیت شخص کو بھکاری بنا دیتی ہے آپ محسوس کریں گے کہ وہ کسی نہ کسی چیز کی تلاش میں ہوتا ہے۔ اگر وہ سگریٹ یا ماچس کا سوال نہ بھی کرے تو ایش ٹرے کا ضرور طلبگار ہو گا۔ سگریٹ نوش عام طور پر بڑے صبر والے ہوتے ہیں سگریٹ بجھانے سے اگلا سگریٹ سلگانے کی باگ دوڑ تک ان کے صبر کی داد دینا چاہئے۔ دیکھنے میں آیا ہے کہ سموکر بڑے ذہین ہوتے ہیں۔ آپ انہیں سینکڑوں برانڈ چکھا دیں یہ اس سے زیادہ تبصرہ نہیں کر سکیں گے کہ ''یہ ہلکا ہے یہ تیز'' ایک یورپی مفکر اور سموکر ناگ سمتھ سگریٹ کے بارے میں کہتا ہے کہ ''اس کے ایک سرے پر Fire اور دوسرے پر Fool ہوتا ہے'' جس کا ہم قافیہ ترجمہ یہی ہو سکتا ہے کہ اس کے ایک سرے پر آگ دوسرے پر ''ناگ''۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے سگریٹ کے ہر سرے پر ناگ نہیں ناگن بھی ہو سکتی ہے، کیونکہ دنیا کے کئی ملکوں میں تمباکو نوش عورتوں کی تعداد مردوں سے زیادہ ہے۔ سگریٹ نوشی کی Chain کا کوئی سرا نہیں ہوتا جس کے گلے یہ پڑ جائے پھر اس کی باگ سگریٹ کمپنیوں ہاتھ ہوتی ہے، جو اسے چین اسموکر بنا دیتی ہیں۔ اگر سگریٹ نوشی سے کسی کو روکا جائے تو وہ آگ بگولا ہو کر پانی میں آگ لگا سکتا ہے کیونکہ Every thing is fire in the fire اس لئے آگ سے ''آگہی'' بھی ضروری ہے آگ کا ویسے بھی کوئی پرایا نہیں ہوتا یہ سب کو اپنے ساتھ ملا لیتی ہے۔ یوں بھی آگ اور Enemy کو کبھی کم نہیں سمجھنا چاہئے۔

تمباکو کی ایک خوبی یہ ہے کہ یہ ہر جگہ سے مل جاتا ہے اور اس کی خامی یہ ہے کہ اس کو ہر جگہ پی لیا جاتا ہے لیکن یہ کسی بھی جگہ طبیعت کو مطمئن نہیں کرتا۔ یقیناً یہ ایک ایسا جرم ہے جس کی سزا ڈبی کے اندر عمر قید ہے۔ سگریٹ ہی ایک ایسی چیز ہے جس میں ''کش'' اور ''کش'' دونوں ممکن ہوتے ہیں۔

سگریٹ نوش کو تو ویسے بھی کوئی پریشانی نہیں ہوتی خواہ یہ کتنا ہی مہنگا ہو جائے یا اس سے کتنی بیماریاں پھیل جائیں۔ وہ تمام الجھنوں کو اکٹھا کرتا ہے اور اسے تمباکو میں ملا کر دھوئیں میں اڑا دیتا ہے۔ اگر کوئی بھولی بھٹکی پریشانی پیچھے رہ جائے تو پھر وہ اگلا سگریٹ سلگاتا ہے۔ ایک دفعہ ہسپتال میں داخل عطاالحق قاسمی کو ایک ڈاکٹر کہنے لگا کہ سگریٹ کم کر دیں یہ کوئی اچھی چیز نہیں۔ قاسمی مسکرا کر کہنے لگے آپ ڈاکٹر وحید کو جانتے ہیں؟ وہ کہنے لگا ہاں! ان کا انتقال ہوئے تو ایک عرصہ ہو گیا۔ پھر قاسمی صاحب پوچھنے لگے کہ کیا آپ ڈاکٹر نجمی کو جانتے ہیں؟ وہ کہنے لگا ہاں! ان کو بھی رحلت فرمائے دو سال ہو گئے۔ قاسمی صاحب نے ایک اور ڈاکٹر ارشد کے بارے میں دریافت کیا تو وہ پریشان ہو کر کہنے لگا وہ بھی پچھلے مہینے ایک حادثے میں وفات پا چکے لیکن کیا آپ صرف خدا کے پیاروں ہی جانتے ہیں؟ قاسمی صاحب فرمانے لگے نہیں ڈاکٹر صاحب! یہ بات نہیں ہے ان سب مرحومین نے مجھے سگریٹ چھوڑنے کی نصیحت کی تھی۔ یہ سنتے ہی ڈاکٹر نے ان کے پیروں پر ہاتھ رکھتے ہوئے التجا کی کہ میں نے تو صرف سگریٹ کم کرنے کا کہا تھا۔ ایک ماہ بعد پتا چلا کہ موصوف ڈاکٹر ایک حادثے میں اپنی ٹانگ تڑوا کر نصیحت کا کفارہ ادا کر بیٹھے ہیں۔ اس واقعے کے بعد کئی ''بیمار'' ان کی ڈبیہ سے سگریٹ لے کر ''تالابِ حیات'' سے گھونٹ پی چکے ہیں۔

☆.....☆.....☆

''اعلان''

کئی مزاحتی، حکومتی اور تعزیتی اعلان ایسے خطرناک ہوتے ہیں کہ انہیں سنتے ہی ہاتھ پاؤں تو کیا کان بھی ''سن'' ہو جاتے ہیں، پھر یہ اچانک کھڑے ہو جاتے ہیں اور ان کا سیاسی ساتھ دینے کے لئے ہم خیال رونگٹے بھی کچھ ایسا ہی کرتے ہیں اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ سارے ''جسم'' کی فکران دونوں کو ہے۔ مجبوری یہ ہے کہ ہماری آنکھیں ہمارے کانوں کو براہ راست دیکھ نہیں سکتیں چنانچہ ہمارے کان ہماری آنکھوں کے اشارے سمجھنے سے قاصر ہیں اس لئے ان میں ہم آہنگی نام کی چیز ہی نہیں ہے اور جب ہم آہنگی کم ہو تو ان کے علیحدہ علیحدہ اعلامیہ جاری ہوتے رہتے ہیں۔

اعلان سننے کے بعد کان اگلی کارروائی کے لیے یہ ماجرہ آنکھوں کے سامنے رکھ دیتے ہیں جن کا کام معاملات کو نم ناک کرنے کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا، چاہے اعلان کے یہ جملے دکھوں بھرے ہوں یا خوشیوں بھرے۔ اناؤنسمنٹ یا اعلانات زیادہ تر پریشانی کا باعث ہی ہوا کرتے ہیں ان کے کرنے اور سننے میں اکثر فرق ہوتا ہے۔ اگر کوئی سامع کسی اعلان سے خوشخبری کی قاش نکال لیتا ہے تو وہ خوش قسمت کہلا سکتا ہے۔ صرف ایک ایچ کے اعلان کے بعد کئی دفعہ صورت حال بڑی مضحکہ خیز بھی ہو جاتی ہے اور مختلف جگہوں پر ایک ایک کلومیٹر لمبی لائنیں لگ جاتی ہیں۔ جیسے ائرپورٹ پر یہ ضروری اعلان ہو رہا تھا کہ کوئی شخص کاؤنٹر پر اپنا آلہ سماعت بھول گیا ہے اگر وہ اعلان سنے تو نشانی بتا کر کاؤنٹر نمبر دو سے حاصل کر سکتا ہے!!!

اگر حکومت کے کسی اعلان کے ساتھ ہی ٹائر جلنے کی بو آنے لگے تو جان لیں کہ یہ حسبہ بل کی طرح ذرا کچا ہے۔ حکومت نے تیتر کے شکار پر پابندی کا اعلان کرنا ہو تو وہ بھی کئی حلقوں کے لیے آدھا تیتر اور آدھا بٹیر ہوتا ہے۔ میں نے اپنے ایک غیر اعلانیہ دوست سے درخواست کی کہ کہیں سے تھوڑی سی چینی کا بندوبست کرے تو وہ میری تھوڑی کو ہاتھ لگا کر کہنے لگا کہ چینی تھوڑی استعمال کیا کرو! اگر چینی نہیں ملتی تو دار چینی استعمال کر لو۔ یہ وہی ناہنجار ہے جسے ایک دفعہ گھی اور

آٹے میں ذرا گھاٹا پڑا تو ''ہر گی'' پڑ گئی تھی۔ اس کے مطابق ادھر کوئی آمر آ جائے تو اس کی وردی اتارنے کا اعلان پاکستان کے قرضے اتارنے سے زیادہ مشکل نظر آتا ہے۔ اگر آپ چینی کے لیے لائن میں لگے ہیں تو یوٹیلٹی سٹور کا ''ڈک چینی'' یہ اعلان کرتا ہے کہ چینی ختم ہو گئی ہے لہٰذا آپ کل اسی وقت اسی جگہ دوبارہ زحمت کریں۔ ہم پاکستانیوں کو ان پریشان حال امور پر ویسے بھی بہت سبقت حاصل ہے۔

ہمیں یقین ہوتا ہے چینی آج نہیں تو ہفتے بعد مل جائے گی آپ ہی بتائیں اس قطار میں لگے کسی ''چینی'' پر کیا گزرے گی؟ حکومت اور اداکارہ میں یہ فرق ہوتا ہے کہ حکومت اعلان پہلے کرتی ہے اور عمل درآمد بعد میں ورنہ اس سے بہتر تو اداکارہ ہوتی ہے جو عرصے ''بعد'' میں شادی کا ''نومولود'' اعلان کرتی ہے۔ اداکاراؤں کی شادی کا اعلان بھی بڑی اہمیت کا حامل ہوتا ہے کیونکہ شادی لفظ نہیں پورا جملہ ہوتا ہے!!! اداکارائیں بدھو قسم کے مردوں کو پسند کرتی ہیں اور مرد اپنے آپ کو بدھو منوانے کے لیے ساری زندگی جدوجہد کرتا ہے اور بالآخر بدھ کے روز دم دے کر اپنی وفا ثابت کر دیتا ہے۔ بچپن میں ٹی وی پر لگنے والی فلم کے لیے ہر اتوار صبح دس بجے بے تابی کے ساتھ انتظار کیا جاتا تھا۔ عین دس بجے جب یہ اعلان ہوتا کہ ہم معذرت خواہ ہیں کہ آج پیش کی جانے والے اردو فیچر فلم ''اعلان'' چند وجوہات کی وجہ سے پیش نہیں کی جا رہی۔ آیئے دیکھتے ہیں سیاسی گفتگو پر مبنی پروگرام ''بوریت''۔ یہ اعلان سنتے ہی پورے جسم میں بوریت کی لہر دوڑ جاتی۔ آپ نے محسوس کیا ہو گا کہ ایک اعلان ہوتا ہے اور ایک ضروری اعلان۔ حکومت کو ضروری اعلان کی ضرورت کم پیش آتی ہے اس کے برعکس ضروری اعلانات صرف محلوں تک محدود ہوتے ہیں۔ اگر کسی خبر میں آدھی بات پوشیدہ رکھی گئی ہو تو آپ اسے اعلانوں کا اعلان کہہ سکتے ہیں اعلان کے بعد اس سے لاتعلقی کا اظہار کرنا ایسے ہی ہوتا ہے جیسے مرنے کے بعد خودکشی کی کوشش۔ میرے دوست کے مطابق آئندہ سب سے اچھا اعلامیہ یہ ہو سکتا ہے کہ حکومت نے اعلان کیا ہے کہ اب وہ کوئی نیا اعلان نہیں کرے گی۔

☆.....☆.....☆

کچھ چٹ پٹا

تجربہ کار لوگ کہتے ہیں کہ مشورہ، سنترہ اور سہارا جہاں سے ملے اسے حاصل کرنے میں دیر نہیں کرنا چاہئے۔ اِدھر اُدھر سے کچھ مفید مشورے اکٹھے کئے ہیں، جو حاضر خدمت ہیں استفادہ کیجئے۔

☆ سونے کا چمچ منہ میں لے کر پیدا ہونے والا اگر کسی وجہ سے اسے نگل لے تو اسے سہاگہ کھلائیں۔ (جیولر زایسوسی ایشن)

☆ اپنا جوتا ہمیشہ ایک نمبر بڑا خریدیں ہو سکتا ہے کہ کسی بھی لمحے جوتوں میں دال بٹنے لگے۔ (ایک شر پسند)

☆ مچھلی کا جال بنانے کا آسان طریقہ: کچھ سوراخ جمع کر کے ان کو جوڑ لیں لیجئے! بس جال تیار ہے (آسان کاروبار گائیڈ)

☆ خریداری سے پہلے ہر چیز کو ٹھونک بجا کر خریدنا چاہیے بھلے یہ طبلہ ہی کیوں نہ ہو۔ (تجربہ کار)

☆ ہر شخص کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش نہ کریں خاص طور پر اپنے سسر کے نقش قدم پر۔ (لاغر لاہوری)

☆ جدید تحقیق: اب سیشل لائزیشن کا دور ہے اگر آپ نے کسی کی صحبت کے لیے ''وش'' کرنا ہو تو، ایسے کریں: خدا آپ کا دایاں گردہ ٹھیک کر دے!

☆ ایک خوش گمانی: آنے والے دور میں آپ اپنے جسمانی اعضا کو بھی ضرورت کے مطابق اوپر تلے کر سکیں گے اور اپنی بیک بون کو جسم میں 360 جگہ استعمال میں لانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگائیں گے۔

☆ اگر آپ کا بچہ کوئی سکہ نگل گیا ہے تو اس کا فوری آپریشن نہ کروائیں کیونکہ یہ آپ کے مستقبل کی بچت ہے۔ (ایک بینک)

☆ منافع خور اُسے کہتے ہیں جو حلال سے ''رچ'' چکا ہو اور آدم خور اسے جو معاشرے سے لہٰذا ان دونوں کو معاشرے کی پہنچ سے دور رکھیں۔ (ایک مراسلہ)

☆ ایسے ترقی پسندوں سے خدا کی پناہ! جو بستر پر لیٹ کر دوسروں کو اپنے پیروں پر

کھڑنے ہونے کا مشورہ دیں۔ (ایک رعا)

☆ کرکٹ مہذب بناتی ہے لہٰذا امریکیوں کو اب اس کھیل میں بھی دلچسپی لینا چاہئے۔ (حشاش بش شاش)

☆ آج کا کام کل پر نہ ڈالیں اور آج ہی فریج میں پڑی ہر چیز کو چٹ کر ڈالیں۔ (مشیر بٹ)

☆ اگر پاؤں کی انگلیاں لمبی ہوں تو جرابوں کی بجائے دستانے پہننا مفید رہتا ہے۔ (ایک بیوٹیشن)

☆ لوڈشیڈنگ میں موم بتی کی بجائے دل جلانے کی کوشش نہ کریں۔ (ماہر امراض قلب)

☆ دولت اور وقت دونوں ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں آپ ان کو ضرورت کے وقت نکالتے ہیں، ضائع بھی کرتے ہیں بچاتے بھی ہیں لہٰذا گھڑی خریدنے کا ارادہ فی الفور ترک کر دیں۔ (دوہری بچت سکیم)

☆ گھر میں کبھی کتا نہ رکھیں کیونکہ اگر کتا بیمار ہو جائے تو پھر ساری رات اس کے شوقین کو ہی پہرا دینا پڑتا ہے۔ (ایک سکیورٹی کمپنی)

☆ شور سے تنگ آ کر اپنے کانوں کو نیکے سے "سُن" نہ کروائیں بہتر ہے کہ اسے "سن" کر ہی برداشت کریں۔ (پلوشن کنٹرول مینجمنٹ)

☆ آپ کا بیٹا ایک سال میں صرف چھ تک گنتی سیکھ پایا ہے تو پریشان نہ ہوں وہ بڑا ہو کر کرکٹ کا امپائر بن سکتا ہے اور اگر وہ بھی نہیں تو ہاکی کا تو لازمی بن جائے گا۔ (ڈاکٹر تسلی بخش)

☆ جسمانی "گفتگو" سے بھی پرہیز ضروری ہے کیونکہ بعض اوقات جسم وہ بیان کر دیتا ہے جو زبان بیان نہیں کر سکتی۔ (باڈی لینگویج سکول)

☆ بوٹ اور ٹائی کی قیمت کا کبھی موازنہ نہ کریں کیونکہ بوٹ گلے میں نہیں ڈالے جاتے۔ (ایک دوکاندار)

☆ طلبا کو بستہ اور اساتذہ کو طالب علموں کے لیے کمر بستہ ہونا چاہئے۔ (ہیڈ ماسٹر)

☆ ہر چیز کی رسید لے لیں حتیٰ کہ کسی بے قصور کو مکا رسید کر کے بھی۔ (کارپوریٹ پہلوان)

☆ ہمارے ساتھ بھارت کا ہر انداز اور برتاؤ تا حال فلمی ہے کیونکہ ابھی تک وہ مذاکرات سے شاہ رخ کی سی بے رخی برت رہا ہے اور لاروا تا کی طرح لارے لگا رہا ہے۔ (دوست بناؤ تنظیم)

☆.....☆.....☆

ناغوں کا ناغہ

جان سیلڈن کہتا ہے ''خوشی کسی چیز کا نام نہیں یہ صرف تکالیف کے ناغے کا نام ہے'' اگر اس قول کو مدنظر رکھا جائے تو ہمارے ملک میں صحت کا وجود بھی بیماریوں کے درمیان ناغے کا نام ہے اور اسی بنا پر خوشیاں بھی پریشانیوں کے ناغے کو کہتے ہیں جبکہ آج کل جو سردی پڑ رہی ہے یہ گرمیوں کا ناغہ ہے۔ قوم نے آج جیسے ہی منگلا ڈیم سے پانی کے اخراج کا ناغہ شروع کرنے کی سلائیڈ دیکھی تو انہیں یوں محسوس ہوا کہ جیسے منگلا کو کسی ''جنگلا'' میں بند کر دیا گیا ہو۔ اس خبر نے، کسی بھی لفظ میں حرف ''گ'' کے آنے کے متعلق کئی سوالات پیدا کرنے شروع کر دیے ہیں۔ مثلاً اگر کسی چیز میں یہ حرف گ آ جائے تو صرف اس کی کمیابی ہی کیوں ہوتی ہے اور اسی پر ہی کیوں ''حرف'' آتا ہے۔ اگر سر پر گیسو کی بھیتی اپنے ناغے شروع کر دے تو گنجا پن سر پر سوار ہو جاتا ہے۔ شاید کسی شاعر کا گریبان کا چاک ہونا بھی دیدار کے ناغوں کی ہی کڑی ہو۔ اس حرف نے کیسے کیسے ناغے کرائے ہیں شمس و قمر کی روشنی میں گرہن کا ناغہ ڈالا گیا، گفتگو کے لفظ میں دو دفعہ اس حرف کا شامل ہونا اس بات کا غمازی ہے کہ اس میں بھی ناغہ کی بجائے ناغے کئے جائیں ورنہ یہ گفتگو ''گلے'' پڑ جائے گی۔ گناہ میں اس لفظ کی موجودگی کہتی ہے کہ گناہوں سے مکمل ناغہ رکھو۔ یہ بات بھی مشہور ہے کہ گیدڑ کی موت آئے تو وہ گاؤں کا رخ کرتا ہے جہاں اس کے ''ناغے'' کا فوری اہتمام کر دیا جاتا ہے اور اسی طرح ''گیہوں'' کے ساتھ گھن کا بھی ''ناغہ'' ہو جاتا ہے۔

بقول زاوی! اگر گنگا ہمارے ملک میں بہتی تو شاید ہم اس میں ہاتھ دھونے کی بجائے ہاتھ صاف کر چکے ہوتے۔ اب اس کا کیا کریں جو گورنمنٹ میں بھی یہ حرف آن ٹپکا ہے اور گورنمنٹ کسی بھی سیاستدان کو گرفتار کر کے اس کے سیاسی امور میں ناغے کرا دیتی ہے۔ شاید اسی وجہ سے گجر بھی مہینے میں دودھ کے ایک دو ناغے کر دیتے ہیں دودھ کے صارفین کو ناغہ، صرف ناگاہ قبول ہے مگر ملاوٹ قبول نہیں اور قوم کہتی ہے کہ کم از کم شیر فروش کو ضمیر فروش نہیں ہونا چاہئے کیونکہ یہ قبیح عمل بچوں کی حق تلفی کا باعث ہے۔

ہمارے ہاں کئی عشروں سے نائٹروجن گوشت کا عمل وقوع پذیر ہے اور اب گیس کا بھی شروع ہو چکا ہے۔ یہ بھی امکان ہے کہ چوبیس گھنٹوں میں دو گھنٹوں کا ناغہ کر کے بائیس گھنٹے کر دیے جائیں۔ یہ امر لازم ہے کہ گوشت، گیس اور گندم کے ناغوں کی ناکامی کے باعث شاید ہمیں گھی، گڑ اور گھنٹوں کے ناغوں کے کڑوے گھونٹ بھی بھرنا پڑ سکتے ہیں۔ لہٰذا ہمیں چاہئے کہ کوئی تدبیر کر کے ناغوں سے بروقت جان چھڑالی جائے کیونکہ وقت وقت کا راگ اچھا ہوتا ہے اور وقت کا رونا بے وقت کی ہنسی سے اچھا ہوتا ہے۔ وقفے اور ناغے میں باغ اور باغی جیسا فرق ہے۔ بیماری کی حالت میں اچھا طبیب وقفہ طعام کا مشورہ دیتا ہے نہ کہ مکمل ناغے کا۔ ہم سب آگاہ ہیں کہ صرف وقتاً فوقتاً وقفہ اور ناغہ فائدہ دیتا ہے وقفے اور ناغے میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ دواء لینے میں وقفہ، فائدہ دیتا ہے اور ناغہ کرنے میں مکمل نقصان۔ کئی لوگ شیو کرنے کے عمل میں بھی ایک آدھ وقفہ کر لیتے ہیں تاکہ اپنی اسکن، استرا اور اصراف بچائے جا سکیں۔ ہمارے ملک میں گھٹائیں چلنے میں بھی وقفہ آجاتا ہے اور گرج چمک میں لمبے ناغے آجاتے ہیں ناغوں کو فروغ دینے والوں کے حوالے سے عرض ہے کہ اگر کوئی بات وعدہ کی بجائے وعدوں پر چلی جائے تو سمجھ لیں دھوکہ ہو چکا۔ باقی دنیا میں ناغے کی زندگی عارضی ہوتی ہے اور ہمارے ہاں یہ دائمی بیماری کی طرح قوم کو نرغے میں لئے ہوئے ہے۔ قارئین اور قائدین! ہمیں مستقبل کے لیے خاص پلاننگ کرنا ہوگی یا ناغے کا وجود کسی بادشاہ کی بادشاہت کی طرح دائمی تصور کرنا ہوگا جیسے محل کے ایک کمرے میں بادشاہ اس عالم فانی سے کوچ کر رہا ہوتا ہے اور دوسرے کمرے سے بادشاہ ''سلامت'' کی درازی عمر کی آوازیں بلند ہو رہی ہوتی ہیں۔ ہمارے ہاں گ والے الفاظ کے ناغوں پر یقیناً بہت زور دیا جاتا ہے لیکن اس مفروضے پر مکمل یقین اس وقت ہوگا جب گل چھرّے اُڑانے کا ناغہ بھی شروع ہو جائے:

بقول حاجی بشیر احمد بشیر مرحوم

ہم آپ ہیں راستے کا پتھر
ہر شخص کو سامنا ہے اپنا

☆.....☆.....☆

فاعلن مفاعلن پردیسی

شاعر بذاتِ خود کسی بھی معاشرے کا اہم "رکن" ہوتا ہے وہ اپنے منظوم پیغام کے ذریعے کسی بھی معاشرے، مشاعرے اور جغرافیے کے کنگرے ہلا سکتا ہے۔ شاعری کا زوردار پیغام بالکل ایسے ہی ہوتا ہے جیسے موبائل فون سے Send کا بٹن دبتے ہی دوسرے کے دل پر اثرات مرتب ہونے لگتے ہیں۔ تنہائی شاعری کے لیے دواء اور اداکاری کے لیے سزا ثابت ہوتی ہے اور اسی طرح میل جول شاعری کے لیے سزا اور اداکاری کے لیے دواء۔ اگر اس قسم کی جزا اور سزا سے بچنا ہو تو کم از کم شہر ضرور بدل لینا چاہئے ورنہ اچھی سے اچھی اداؤں پر بھی انگلی اٹھ سکتی ہے۔ یہ بات تجربے میں آئی ہے کہ شاعر اور امپائر میں فقط ایک انگلی کا فرق ہوتا ہے امپائر کسی کھلاڑی کی ناکامی پر انگلی کھڑی کرتا ہے اور شاعر اسے دانتوں تلے دباتا ہے۔ کردار ایک ایسی دواء ہے جو انسان کو خاموشیاں رکھتی ہے لیکن اس کی خرابی انسان کو وقت سے پہلے مار بھی دیتی ہے۔ اگر کسی انسان کے کردار کی صحیح طریقے سے Base نہ بن پائے تو بالآخر اسے Face، دیس یا بھیس بدلنا پڑتا ہے۔ کسی شاعر کے اشعار کی زمین بھی بڑی اہم ہوتی ہے لیکن بدقسمتی سے اس زمین کی رجسٹری ہو سکتی ہے اور نہ ہی "فرد" کا انتقال چڑھتا ہے اگر کوئی فرد نادانستہ طور پر ایسا کر بیٹھے تو سمجھ لیں اس کا شاعرانہ کیریئر عالم نزع میں پہنچ چکا۔ شعراء کے اشعار کی زمین بلاشبہ موجود تو ہوتی ہے لیکن اسے کسی کمین، جانشین اور کی کمین کی ضرورت نہیں ہوتی جبکہ ان شعراء کا ماہرین، مفکرین اور ناقدین سے استفادہ بالیدگی اور بڑھوتری کے لیے ضروری ہوتا ہے چنانچہ ان کی زمین پر کسی دوسرے شاعر کی شاعری کی کاشت ناممکنات میں سے ہوا کرتی ہے اور یہ عمل ایسے ہی ہے جیسے کسی سمندر میں بیج پھینک دیا جائے۔ اس کے باوجود کسی شاعر کے ذاتی "قطعہ" پر دوسرے شعرا کے قبضے جاری رہتے ہیں۔ اپنے قطعات سے محروم ہو جانے والے شاعروں کے مطابق دنیا میں کوئی ایسی عدالت ضرور ہونی چاہئے جہاں درخواست دے کر شاعر بھی کچھ دائر کر سکیں اور اپنے قطعات "واگزار" کروا سکیں۔ اپنی کمزور کتاب پر کسی دوسرے کی سوچ کا چمڑا چڑھا کر اسے موٹا کرنے کی کوشش انتہائی کمزور فکر ہے جسے پوری دنیا میں کہیں بھی سراہا نہیں جاتا۔ یہ سچ ہے کہ شاعر اپنے کلام میں اکثر جھوٹ بولتے ہیں بلکہ وہ اپنے کسی جھوٹ

کا سچا اظہار کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔

ہمارے فاعلن مفاعلن پردیسی صاحب ایک اچھوتے انداز کے شاعر ہیں اور اپنے محلے کی حد تک منفرد شاعر کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ یہ ان کا قلمی نام ہے جو پورے وزن اور دنوں کا ہے بلکہ ان کی شخصیت سے زیادہ وزنی معلوم ہوتا ہے۔ نام بھی کئی قسموں کے ہوتے ہیں جیسے ہمارے شیخ رشید کے قلمی، فلمی اور عوامی نام بھی مشہور ہو چکے ہیں لیکن نام کا اُنگ یا رنگ ذرا دبنگ ہی ہونا چاہئے۔ اگر کوئی شاعر اپنا تخلص ''عظیم'' رکھ لے تو وہ روزِ اول سے ہی عظیم شاعر کہلائے گا۔ قلمی نام اور قلمی آم ویسے بھی میٹھے ہوتے ہیں لیکن اپنے اپنے ''سیزن'' میں۔ سمجھ دار شاعر اپنے نام کے ساتھ تخلص کی سٹپنی کچھ اس وجہ سے بھی لگاتے ہیں کہ شاعری کرتے ہوئے ان کے اصلی نام پر کوئی حرف نہ آئے اگر تخلص اصلی نام کا ہم قافیہ ہو تو نام پر حرف آئے گا اور نہ کلام پر۔ ویسے یہ حرف شناسی کے عمل سے بھی حرف بہ حرف واقف ہیں۔ جوانی میں ان کی پوری کوشش تھی کہ کسی نہ کسی طرح فلمی شاعر کے طور پر پروان چڑھا جائے اور فلم خطرناک کے مزید ''خطرناک'' گانے لکھ کر افسوس ناک شاعر کے طور پر مشہور ہوا جائے۔ لیکن شاید ان کے نصیبوں نے یہ خطرہ ٹالا، یہ فلمی شاعر بن سکے اور نہ ہی رہی۔ آج کل ان کی کوشش ہوتی ہے کہ شعر نہیں تو کم از کم قافیہ ہی مزاحیہ ہو جائے۔ بقول ان کے، کسی شاعر کو جب تک نظم ہضم نہ ہو جائے اسے اپنی غزل کا ایک مصرعہ بھی چکھنا نہیں چاہئے اگر کوئی انہیں اپنی نظم سنانے کی کوشش کرے تو اس کا پہلا شعر سنتے ہی یوں گویا ہوتے ہیں:

عرض کیا ہے،
سکتہ میں نے،
پکڑ لیا ہے۔

شاعری کے ساتھ ساتھ کھانوں کا بھی بہت شوق ہے اس لئے شاعری، نہاری اور پرہیزگاری کو ایک نظر نہیں دیکھتے۔ اب یہ خود اپنی زندگی کے مقطع میں جھول رہے ہیں چنانچہ شاعروں مشاعروں اور ہتھیاروں سے ذرا دور ہی رہتے ہیں۔ انہوں نے جتنے قطعے کہے ہیں اتنے کسی حکومت سے الاٹ کروائے ہوتے تو آج یہ شاعری کی بجائے زائر ہوتے اور وہ بھی کسی ''ٹھنڈے'' ملک کے۔

☆.....☆.....☆

''گڈمڈ''

لفظوں کو آپس میں گڈمڈ کر کے نئے الفاظ اور خوبصورت اصطلاحیں تو بن جاتی ہیں لیکن ان کا کسی زبان میں نفاذ اتنا آسان نہیں ہوتا۔ اساتذہ کرام نے یہ مشق سخن کر کے جہاں اردو کو ترقی بخشی ہے وہاں اردو سیکھنے والے کسی غیر ملکی کے لئے کچھ پریشانی کا موجب بھی بنا دیا ہے۔ یہ اصطلاحیہ الفاظ ہر غیر ملکی کو ہی مشکلات سے دو چار کرتے ہیں کیونکہ یہ ذومعنی ہوتے ہیں۔ فرض کریں ایک انگریز نئی نئی اردو سیکھ کر آپ کے پاس آئے اور آپ اس سے سوال پوچھیں ''آپ اردو زبان سیکھنے کے کارخیر میں دوڑ دھوپ کرتے ہوئے کتنے شب و روز، سرگرداں رہے کیا اس جفاکشی میں دن رات کا ایک کرنا آپ کے لیے کارآمد یا سودمند ثابت ہوا؟'' یہ سوال کسی غیر ملکی کے لیے بلاشبہ دردناک ثابت ضرور ہوگا: حالانکہ یہ سوال اردو میں ہے۔ اگر کسی انگریز کے ساتھ آپ Idioms بھری انگریزی استعمال کریں تو یہ بھی اس کے لئے ''ہولناک'' ثابت ہوسکتی ہے اور کسی امریکی کے لیے تو یہ جملہ سمجھنا بھی مشکل ہوتا ہے The white elephant wins by a neck۔ کسی بھی زبان میں اصطلاحوں کے ''اُپس اینڈ ڈاؤن'' آتے رہتے ہیں اور ان نئے الفاظ کا وجود میں آنا بھی بڑا عجیب اور مضحکہ خیز ہوتا ہے اور وقتاً فوقتاً رونما ہونے والے واقعات اور ان پر پیش کئے گئے تبصروں کے باعث ضرب المثل اور محاورے وجود میں آتے ہیں جنہیں بعد ازاں، ماہرین زباں، ناگہاں اپنی لغت میں شامل کر لیتے ہیں تاکہ مختصر بات سے پورا تاثر سمجھ آجا سکے جیسے ''عزیز ہم وطنو''۔ چنانچہ اپنے غیر ملکی احباب کے لیے کچھ الفاظ تلاش کیے ہیں جو ان کے اردو سیکھنے کے شوق کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے ''حاضر خدمت'' ہیں:

دوڑ دھوپ کرنا: محنت کرنے کے بعد سونے کے لیے مزید محنت کی ضرورت نہیں ہوتی محنت کے بعد دولت آئے نہ آئے نیند ضرور مہربان ہوتی ہے اور نیند آور گولیوں کے لیے دوڑ دھوپ کم ہی کرنا پڑتی ہے۔ ہمارے ہاں ویسے بھی بادلوں اور بارشوں کا سلسلہ کم ہی ہوتا ہے اور

ہمیں سال میں ساڑھے گیارہ مہینے دھوپ سے بچنے کے لیے دوڑ دھوپ کرنا پڑتی ہے اگر بارش ہو بھی جائے تو اس سے بچنے کے لئے ایک علیحدہ قسم کی دوڑ دھوپ۔ بہترین قومیں ترقی کرنے کی خاطر اپنے دن رات ایک کر دیتی ہیں لیکن ہمارے ہاں لوڈ شیڈنگ نے یہ عمل اپنے ذمہ لیا ہوا ہے۔ کسی ملک کے دن کو رات اور رات کو تاریکی میں تبدیل کرنے کے لیے ہمارا دشمن ملک بھی ہم سے صلاح لے سکتا ہے۔ لوڈ شیڈنگ کے معاملے میں عوام کو مسلسل اندھیرے میں رکھنا بھی ایک فن ہے بلکہ یہ ایک طرز سیاست بھی ہے۔ ہمارے ہاں امیدوار ووٹ کے حصول کے لیے بہت دوڑ دھوپ کرتے ہیں لیکن بعد ازاں ووٹر انہیں ایک نظر دیکھنے کے لیے سرگرداں نظر آتے ہیں۔

سرگرداں: کسی کام کی خاطر اتنی بھاگ دوڑ کرنا کہ کاسۂ سر گرد آلود ہو جائے مگر گدا گر یا چور کی ایسی حرکت کو ان معنوں میں استعمال کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی واپڈا کا میٹر ریڈر بجلی کی پیمائش کرتے ہوئے سرگرداں پایا جاتا ہے ان امور کو مصروفیت کا نام کبھی نہیں دیا جا سکتا۔ بھلا گداگری یا چوری چکاری کو کون مصروفیت کا نام دے گا۔ ان مہینہ لوگوں کا پیچھا کرتے ہوئے اور ان کو دھر لینے کے قصد کو ضرور ''اپنے کام میں سرگرداں'' کہیں گے۔ سنا ہے ایک گرام سونے کے لیے ایک ٹن سے زائد مٹی کو چھانا جاتا ہے۔ سونے کی تلاش کے لیے ایک خاص قسم کی چھانی کی ضرورت ہوا کرتی ہے البتہ جس شخص نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہو اور نگر نگر کی خاک چھانی ہو اس کا ہر عمل ہی سونے میں تولا جانا چاہئے۔ مگر ان لوگوں سے بھی بچنا ضروری ہوتا ہے جو بغیر کسی وجہ کے محنت سے دل چرانے کی سرتوڑ کوشش کرتے ہیں۔

دل چرانا: دل چرانے کے مترادف کوئی اور دلنشیں لفظ کم ہی ملتا ہے شاید اس لئے اسے جرائم میں شمار کیا جاتا اور نہ دل چرانے پر کوئی حد، وغیرہ لگتی ہے۔ سست انسان دل اس وقت چراتا ہے جب کسی کام میں اس کی دل جمعی نہ ہو لیکن یہ ایک غیر ذمہ دارانہ فعل ضرور ہے اور غیر ذمہ داری ایک بڑا جرم ہے اس لئے کئی شکستہ دل اس فعل میں ملوث ہو جاتے ہیں مگر ایک اہم بات یہ ہے کہ دل کی بیماری سے دل چرانا طبیب کی دل شکنی کا باعث تو بنتا ہی ہے مریض کے لیے بھی خطرے کا دور ''دورہ'' رہتا ہے۔ لہٰذا اسے اس بیماری کو کبھی پس پشت نہیں ڈالنا چاہئے کیونکہ دل کا معاملہ ہوتا ہے۔

☆.....☆.....☆

''گڈ مڈ ۱۱''

دن بھاری ہونا: مشکلات۔ ہر رقص کے شوقین کے لیے شاید ہر دن بھاری ہوتا ہے اور اُسے ہمیشہ رات کا انتظار رہتا ہے۔ اگر کسی شخص کا دن اچھا گزر جائے تو وہ رات کو بغلیں بجاتا ہے آپ نے کبھی نہیں سنا ہوگا کہ مرد وزن دن میں رقص کرتے ہیں اگر دن میں کوئی بے اختیار ایسی حرکات کرے تو سمجھ لیں یہ اس خواجہ سراء کا کام ہے جو دن کا بوجھ ہلکا کر رہا ہے۔ ہمارے ہاں غریبوں کا ہر دن بھاری اور شام خواری اور رات اندھیاری ہوا کرتی ہے اس لئے انہیں ہر پل بھنگڑا ڈالنا مفید ہوسکتا ہے چنانچہ صرف چمکتے دن کو ہی موردالزام ٹھہرانا کوئی ''کارِ خیر'' نہیں ہے۔

کارِ خیر: نیک کام۔ خیر کا مطلب تو سب جانتے ہیں لیکن کار کے معنی، کام کے علاوہ، ایک ایسی تیز رفتار گاڑی کے بھی ہیں جسے اَن پڑھ ڈرائیور سپیڈ سے چلا کر مسافروں سے خیر خواہی کا دعویٰ کرتے ہیں اور جن کے خلاف کوئی قانونی کارروائی بھی نہیں ہوا کرتی۔ کارِ خیر کے کئی مطالب نکالے جاسکتے ہیں۔ ایک تخریب کار، کار چوری کرنے کے بعد اپنے کسی پیروکار کے ذریعے معصوم لوگوں کا شکار کر کے، یہی کرتا ہے؟ وہ اپنے پیروکاروں کے سامنے اپنے بھیانک عمل کو ایک کارِ خیر کے طور پر ہی پیش کرتا ہے خدا جانے یہ اقدام شکار کرنے والے کے لیے سودمند ہوتا ہے یا ہونے والوں کیلئے۔ ویسے ہمارے ہاں انسانوں کی دو قسمیں ہیں ایک شکاری اور دوسرا شکار۔

سودمند: ویسے تو اس کے معنی فائدے کے ہیں لیکن ''مند'' شاید مندی سے نکلا ہے جس کے معنی ظاہر ہے نقصان کے ہیں اور سود سے کب کوئی آسودہ ہوتا ہے۔ دراصل یہ لفظ ظاہر کرتا ہے کہ سود سے مندا ہی مندا ہے۔ کسی عقل مند کو اس بات پر رضامند کرنا کہ بینک میں پیسے رکھنا اس کے لیے سودمند ہوگا کسی ہوش مند کے لیے ممکن نہیں حالانکہ اکاؤنٹ ہولڈر سمجھ رہا ہوتا ہے کہ

وہ دودھوں نہا گیا ہے۔

دودھوں نہانا: رولتمندی۔ تجربے میں آیا ہے انسان جوں جوں دولت مند ہوتا ہے وہ پانی سے ویسے ہی خوف زدہ ہوتا شروع ہو جاتا ہے کیونکہ اسے یہ ڈر ہوتا ہے کہ کہیں اس کی جمع شدہ پونجی پانی کی طرح بہنا شروع نہ ہو جائے لہٰذا دودھ سے نہانا تو درکنار اسے پینا بھی نصیب ہو جائے تو سمجھ لیں کہ وہ دودھوں نہا گیا ہے۔ خالص گجر وہ ہوتا ہے جو دودھ بھی خالص دے ورنہ دودھ کا جلا صرف گجر ہی ہوتا ہے کیونکہ دودھ کے حسن کا پہلا دشمن وہی ہوتا ہے اور اس حسن کی آگ کو صرف آگ سمجھ کر اس پر پانی ڈالتا رہتا ہے۔ اگر کوئی گجر دودھ کا کاروبار کسی وجہ سے چھوڑ کر کوئی اور کام شروع کر لے تو وہ کسی اور کام کا نہیں رہتا کیونکہ اس کے حصے کا پانی اس کے سر سے گزر چکا ہوتا ہے۔ دنیا میں سب سے آسان اور منافع بخش کام ظاہر ہے دودھ میں پانی ڈالنا ہے اور دنیا میں صرف اس کا منافع اس کے اپنے ہاتھ ہوتا ہے۔ دودھ میں پانی ملانے کا فری ہینڈ صرف اس کے پاس ہوتا ہے جسے اپنی عزت کا پاس نہیں ہوتا۔ شاید عام لوگوں کو اس کا اندازہ نہیں ہے کہ کالا باغ ڈیم نہ بننے کا سب سے زیادہ دکھ انہیں ہو رہا ہے۔ کالا باغ کے قیام اور اس کی رائے عامہ کو توانائی بخشنے کے لیے دودھ والوں سے بڑھ کر کوئی اور نہیں۔ اگر انہیں کالا باغ ڈیم کے متعلق فری ہینڈ دے دیا جائے تو پھر دیکھیں کیسے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہوتا ہے۔ اگر کوئی دودھ والا ''وہاں'' بھی پہنچ گیا جہاں دودھ کی نہریں بہتی ہیں تو اس کی دسترس سے دودھ کی نہر کو شہد کی ملاوٹ سے بچانے کے لیے کئی ''بہشتی'' مقرر کرنا پڑیں گے۔ ہمارے ہاں اب خالص دودھ کی صرف اصطلاح ہی باقی رہ گئی ہے۔ اگر دودھ والے سے ملاوٹ کا ذکر کر دیا جائے تو وہ اگرچہ دودھ کی طرح سفید ہی ہو فوراً لال پیلا ہو جائے گا۔ خالص دودھ میں ویسے بھی 87 فیصد پانی ہوتا ہے اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ دودھ میں پہلی ملاوٹ از خود گائے یا بھینس ہی کرتی ہے۔ اگرچہ ہمارے ہاں کشادہ دلی پائی جاتی ہے ہم ایک کڑاہی سے دودھ پینے والے کو بھی رضائی بھائی سمجھ کر اس کا قصور معاف کر دیتے ہیں لیکن ان ملاوٹ کرنے والوں کو موقع پر دھر لینے سے معاشرہ صحت مند ہو سکتا ہے۔

☆.....☆.....☆

''وقار مجروح''

تھامس شیڈویل کہتا ہے کہ'' بے وقوف کی پھبتیاں دنیا کی سب سے سست چیز ہے''۔ واقعی اگر ان کی ''پھبتیوں'' کے نتائج پر غور کیا جائے تو ان لوگوں کے انجام سے گردونواح کے لوگ بھی کافی حد تک ''متاثر'' ہوتے ہیں۔ آناً فاناً دولت مند ہو جانے، اپنی منزل فوری پالینے کے خواب اور دوسروں کی کامیابی پر اپنے اعصاب کا کھو دینا بھی ان پھبتیوں کا حصہ ہوتا ہے۔ ویسے اگر مہنگائی کسی قوم کی کمر ''توڑ'' دے تو پھر اس عوام کی پھبتیاں ''قابل دید'' ہوتی ہیں۔ میں اپنی سطروں میں اکثر اپنے دوست وقار مجروح کا ذکر خیر کرتا ہوں اس لئے اس کے تعارف کا چھوٹا سا ٹریلر چلانا چاہتا ہوں۔ کسی محفل میں لوگ اس کی موجودگی اور حرکات کو دیکھ کر یہ پوچھتے ہیں کہ جناب آپ کی تعریف؟ تو یہ ان کے منہ پر ہی کہہ دیتا ہے ''وقار مجروح'' یہ میرے بچپن کا نہ صرف کلاس میٹ ہے بلکہ ''ٹاٹ'' میٹ بھی ہے۔ جیسا کہ آج کل کلاس میں نالائق بچوں کو پچھلے ڈیسکوں پر براجمان کرادیا جاتا ہے، ہمارے زمانے میں بھی ایسا ہی تھا لیکن وقار بہادر مرغا بنے سب سے آگے نظر آیا کرتا تھا۔ یہ اس دور میں بھی اپنے کلاس میٹ کا وقار ملیامیٹ کرنے میں سب سے ''باوقار'' ہوا کرتا تھا مگر پھر بھی وقار بہادر کے نام سے جانا جاتا تھا چنانچہ ایک حادثہ میں زخمی ہونے کے بعد اس نے مجروح تخلص رکھا اور پھر اسے وقار کے ساتھ لگا کر سونے پر سہاگہ کر دیا۔ یہ حادثہ بھی شاید کلاس روم کے فرش کی رگڑ کی وجہ سے پیش آیا تھا اگر اس زمانے میں ٹاٹ کو ''مخمل'' کا پیوند لگانے والی کوئی رفاعی تنظیم ہوتی تو شاید ہم لوگ آج اتنی قوت برداشت کے مالک نہ ہوتے۔

بچپن میں میری کبھی وقار کے ساتھ بن نہ پائی لیکن ایک باوقار شخص کے سمجھانے پر میں نے آج تک اس کو برداشت کیا ہے اور اس شخص نے مجھے صرف یہ گُر سکھایا تھا کہ یہ وقار ایک ایسی سبق آموز مشین ہے جو ہر روز تجھے ایک نیا سبق دے گی یعنی جو کچھ یہ کرتا ہے تم کبھی نہ کرو۔ اس کی خوبی یہ ہے کہ اسے اپنے وقار کی اتنی فکر نہیں ہوتی جتنی دوسرے کا مجروح کرنے کی۔ اگر یہ کسی بارات میں شریک ہو اور دولہے سمیت اس بارات کا وقار مجروح نہ ہو، یہ ممکن ہی

نہیں۔ میٹرک میں پوری تھرڈ ڈویژن حاصل کرنے کے بعد، اگر آپ اس کے کرتوت کی بینس شیٹ بنائیں تو آخر میں آپ کو نقصان کے علاوہ کچھ نظر نہیں آئے گا بلکہ وقار تو کیا! یہ کسی کا بیوپار، سنگھار اور کردار بھی مجروح کر سکتا ہے۔ ایک جگہ یہ اپنا رشتہ مانگنے خود ہی چلا گیا لڑکی کے باپ نے اس سے کہا کہ میں اپنی لڑکی کا ہاتھ کسی بیوقوف کے ہاتھ نہیں دے سکتا یہ اسے کہنے لگا چاچا جی آپ کی بات تو ٹھیک ہے پر آپ تو اس کا ہاتھ چھوڑ دیں۔ بالآخر ایک جگہ اس کی منگنی ہو ہی گئی اس کے سسر نے اسے سمجھایا کہ ابھی اس کو خفیہ رکھنا اس نے پھرتی سے تمام رشتے داروں کے گھر جا کر اس منگنی کو ''خفیہ'' رکھنے کی درخواست کر دی۔

ایک عرصہ قبل اس نے انگریزی میں ایم۔ اے کرنے کی کوشش بھی کی تھی چنانچہ اس وقت سے انگریزوں کا گرویدہ ہو کر رہ گیا ہے۔ انسان کی یہ فطرت ہے کہ وہ بغیر کسی وجہ کے گرویدہ، رنجیدہ اور سنجیدہ نہیں ہوا کرتا۔ جب یہ انگریزی لہجے میں اردو بولے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ لفظ شیطان کو ''She طان'' اور ہیجڑہ کو ''He جڑا'' کہہ کر انگریزی کی جنس بدل رہا ہے۔ چنانچہ اب یہ مسلسل جین پہنتا ہے اور اگر اسے معلوم ہو جائے کہ برمنگھم میں برف پڑ رہی ہے تو یہ جولائی میں بھی پینٹ کوٹ زیب تن کر کے، گھر والوں کو فریج سے برف نکال کر مارتا اور خوش ہوتا ہے۔

عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ غصے کی حالت میں انسان پٹھان بن جاتا ہے لیکن وقار کا معاملہ اس کے برعکس ہے، وہ غصے کی حالت میں بہت کام کی باتیں کرنے لگتا ہے۔ ابھی کل یہ غصے میں کہہ رہا تھا کہ ہمیں ایسے کاموں سے اجتناب کرنا چاہئے جس سے ہمارا عالمی وقار مجروح نہ ہو۔

☆.....☆.....☆

''شادیاں''

آج کل جس گلی میں بھی جائیں شادیاں ہی شادیاں ہیں اور Wedding weather کی بہار! گلیاں محلے ٹینٹوں سے آراستہ ہیں۔لوگ سوچ رہے ہیں کہ چار شادیوں کا سلسلہ چل نکلا تو پلاننگ ڈویژن کی محکمہ فیملی پلاننگ سے ''Engagement'' کرنا پڑے گی تاکہ ان شادیوں سے ''جنم'' لینے والے نئے مسائل کو بھی ''گود'' لیا جاسکے اور جن کو ایک بھی میسر نہیں ان کا بھی کچھ دال دلیا کیا جاسکے۔ ویسے مسئلہ تو ایک بھی گلے پڑ جائے تو اس سے ''خلع'' لینا آسان نہیں ہوتا ہمارے ہاں ایک سے زائد شادی کرنے والوں کا انداز ہماری ہاکی ٹیم جیسا ہوتا ہے کہ اگر وہ اولمپک کھیل رہی ہو تو سمجھ لیں وہ سارک گیم کی تیاریوں میں مصروف ہے۔

شادی کے لئے دولت مندی، دانش مندی یا صحت مندی کی فوری طور پر ضرورت نہیں ہوتی بس نکاح خواں کی رضامندی اور رجسٹر درکار ہوتا ہے لیکن شادی کا ''ہما'' ہر اس سر نہیں بیٹھتا جو سہرا سجالے۔ اگر دلہن کا وزن ضرورت سے زیادہ ہو تو پھر دولہے کو ایک طرح سے اجتماعی شادی کرنا پڑتی ہے اور اگر دولہے کا وزن ضرورت سے کم ہے تو سمجھ لیں کہ یہ اس کی الوداعی شادی ہے۔ اگر سلامی میں کسی جوڑے کو آٹھ دس تولے سونا مل جائے تو اس کی ''چاندی'' ہو جاتی ہے۔ کوئی مرد اگر سیاست میں دلچسپی نہ بھی لے تو شادی کے بعد ''لیڈر'' کہلانے کا مستحق ضرور ہوتا ہے کیونکہ اس نے کئی گھریلو امور صرف کاغذی کارروائی کی حد تک ہی طے کرنا ہوتے ہیں۔ اگر دولہے کا ہاتھ دلہن نے پکڑا ہو تو یہ اندازہ لگا لیا جاتا ہے کہ وہ کوئی اطلاع دینا چاہ رہی ہے جبکہ دولہے نے صرف اپنے دفاع کے لیے اس کا ہاتھ پکڑا ہوتا ہے۔ جوڑے آج کل چونکہ زیر عتاب ہیں اور پولیس اکثر انہیں دھر لیتی ہے چنانچہ پولیس کی اس دست برد میں کئی شادی شدہ جوڑے بھی آ گئے۔ وجہ یہ تھی کہ پولیس کے طلب کرنے پر وہ اپنا نکاح نامہ نہ دکھا سکے۔ لہٰذا ایسے حالات میں ایک جوڑا کورٹ میرج کے لئے جج کے پاس آیا۔ جج نے کہا کہ آج سے

عدالت کی چھٹیاں شروع ہیں لہٰذا آپ ایک ہفتہ بعد سرٹیفکیٹ کے حصول لئے دوبارہ حاضر ہوں۔ دولہا نے گزارش کی جناب! پورا نکاح نامہ بھلے نہ دیں ایک ہفتے کے لئے تو کوئی چٹ وغیرہ دے دیں۔

کہتے ہیں کہ بعض شادیاں کنوارا رہنے کے لیے بھی کی جاتی ہیں۔ اگر نہیں تو میرا کی شادی سے ہمارے لوگوں کو ایک تجربہ ضرور ہوا ہے۔ شادی سے پہلے آپس میں سودے بازی کا انجام بڑا گھناؤنا ہوتا ہے اور بعد میں ڈراؤنا۔ بھارت ایک ایسا ملک ہے جہاں دنیا میں سب سے زیادہ شادیانے بجتے ہیں کیونکہ اس کی آبادی بھی زیادہ ہے اس کے علاوہ فلمی شادیاں اور رہی سہی کسر جانوروں کی آپس میں بندھن باندھ کر کے پوری کر دی جاتی ہے۔ بھارت کے کسی خطے میں بارش نہ ہو تو پھر ڈیم بھرنے کے لیے مینڈکوں کی شادیوں کی خبریں عام ہوتی ہیں اگر ان شادیوں سے بجلی پیدا کرنے کی صلاحیت حاصل کر لی جائے تو بھارت میں لوڈشیڈنگ کا مکمل خاتمہ ہوسکتا ہے۔

ہمارے خطے کے مرد شادیوں کے دلدادہ ہیں یورپ پہنچ کر ان کی پہلی کوشش شادی ہی کے لیے ہوتی ہے تاکہ پردیس میں گھر آباد ہو لیکن کسی یورپی خاتون کا دلہا بننے والے کا حال بالکل ایسے ہی ہوتا ہے جیسے کسی ہندو کے مرنے کے بعد اس کی بیوہ کا۔ دولہے کی پیپر میرج بعد میں اس کے لیے پلاٹنم جوبلی میرج ثابت ہوتی ہے۔ یورپ کی عورتوں کا نقاب سے چونکہ دور کا بھی واسطہ نہیں چنانچہ ہمارے غیر ملکی بھائی اس مفتوحہ ''سلطنت'' کی نقاب کشائی سے بھی محروم رہ جاتے ہیں لیکن ان کی یہی کمزوریاں ان کی طاقت بن جاتی ہیں اور وہ کثیر زرمبادلہ اپنے ملک بھیجنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ شوق شوق میں اگر کسی نے زندگی ہی میں ''ستی'' ہونے کا فیصلہ کرنا ہو یا کم از کم ''سٹنٹ مین'' بننا ہو تو وہ اس بُور کے لڈو کو آزما سکتا ہے لیکن! یہاں ہی کی ایک عورت بینٹ جل کہتی ہے کہ ''اس مرد سے کبھی شادی نہ کرو جو اپنی ماں سے محبت نہیں کرتا کیونکہ وہ اپنی بیوی سے بھی بالآخر نفرت ہی کرے گا۔''

☆.....☆.....☆

مزید تاکید

مشورے، نصیحت اور رائے دینے کے بعد مزید تاکید کی بھی ضرورت محسوس ہوا کرتی ہے کسی کو نصیحت کرنے کے بعد ''فائنل کوٹ'' کرنے کے لیے مزید تاکید اس لئے کی جاتی ہے کہ کئی لوگ اشاروں کی زبان نہیں سمجھ پاتے۔ اگر آپ انہیں فون پر اپنے ہاں دعوت دیں تو وہ اس دور میں بھی دعوتی کارڈ کا اصرار کرتے ہیں۔ دعوتی کارڈز پر مزید تاکید کے نیچے کچھ نام اس لئے لکھے جاتے ہیں تاکہ اگر آپ کا اس دعوت یا شادی میں شرکت کا تھوڑا بہت پروگرام ہو بھی تو وہ بھی ختم ہو جائے کیونکہ اس میں ایک آدھ ایسا نام ہوتا ہے جو خاندان میں بستہ ب کے طور پر مشہور ہوتا ہے۔ چنانچہ جو لوگ اشاروں کی زبان نہیں سمجھتے وہ شعروں، سطروں اور ستاروں کے اثرات کیسے محسوس کر سکیں گے۔ ہارٹ سپیشلسٹ اپنے مریض کو مشورہ دینے کے بعد یہ تسلی بھی دے رہا ہوتا ہے کہ بھائی! بھلے تمہارا دل بڑھ گیا ہے اب کم از کم ان مریضوں کے سامنے اپنا دل چھوٹا مت کرو کیونکہ وہ اپنا دل تھامے بیٹھے ہیں۔ ویسے نصیحت کرتے ہوئے اگلے حملے سے بچنا بھی ایک مہارت ہے چنانچہ اس سے زیادہ بدقسمتی اور کیا ہوگی کہ مچھلی پکڑتے ہوئے شکاری خود پکڑا جائے۔ اگلے دن وقار مجروح بڑے غصے سے میرے پاس آیا اور چند تاکید نامے میرے حوالے کر کے روانہ ہو گیا لیکن میرے جال سے بچ نکلا اس کا تاکید نامہ کچھ ایسے تھا:

☆ انسان کا مزاج بڑی عالی شان چیز ہوتی ہے لہٰذا اپنے مزاج کو کسی کلرک کی مٹھی کی طرح گرم نہ رکھیں۔

☆ گھر میں ٹوسٹروک سگریٹ کا دھواں کبھی نہ چھوڑیں اور V.T.I ''شیشہ'' کا استعمال شروع کر دیں۔

☆ اپنی بیوی کے نازک پیروں کے لیے ہمیشہ نرم جوتا خرید کر دیں کیونکہ امن کسی حالت میں بُرا اور لڑائی کسی حالت میں اچھی نہیں ہوتی۔

☆ بیوی، Boss اور بستر کا ہمیشہ خیال رکھیں ورنہ آپ کا بستر گول ہو سکتا ہے۔

☆ ایڈورٹائزمنٹ بھی ایک پلوشن ہے کبھی جوس کے ٹھیلے پر چلتی ٹیپ یا 1122 کے قریب چند منٹ کھڑے ہو کر آزمائیے۔

☆ پانی کی کمی کو مدنظر رکھتے ہوئے مشک اٹھانے کی مشق آج ہی سے شروع کر دیں۔

☆ یہ لازم نہیں کہ خاموشی کی خوبیاں صرف بول کر ہی بیان کی جاسکتی ہیں کئی دفعہ خاموشی بھی مضبوط دلائل کے طور پر سامنے آیا کرتی ہے۔

☆ سست اور کاہل کو اگلے سال کا انتظار نہیں کرنا چاہئے کیونکہ جیسا پچھلا سال ویسا اگلا سال۔

☆ اگر آپ کسی کے بن گئے ہیں بھیا تو ''بھیا بمک'' نہ بنیں کبھی اس کے لئے۔

☆ کسی حاضر جواب کو غیر حاضر ہونے کی بنا پر کبھی ''لائن حاضر'' نہ کریں۔ شاعر بھی کئی کاموں میں مہارت رکھتے ہیں آپ ان کے اشعار سے بھی کئی تاکیدی نوٹکے حاصل کر سکتے ہیں مثلاً بقول شہزاد احمد گزرنے ہی نہ دی وہ رات میں نے گھڑی پر رکھ دیا تھا ہاتھ میں نے۔

☆ کسی بھی چیز کا سودا دھیان سے کرنا چاہئے چاہے یہ ضمیر ہی کیوں نہ ہو۔

☆ ہیجڑے سے کبھی درج ذیل گانے کی فرمائش نہ کریں کیونکہ اس کی غیرت جاگنے کا ایک خاص وقت ہوتا ہے۔ دکھائے دل جو کسی کا وہ ''آدمی'' کیا ہے کسی کے کام نہ آئے وہ زندگی کیا ہے۔

☆ کسی کی باتوں میں نہ آئیں اور صرف ایک بات پلے سے باندھ لیں کہ بری باتوں پر باتوں باتوں میں بات کی جائے ورنہ بات کہیں اور جا پڑے گی اور بات آپ پر آجائے گی۔

☆ آپ کے کسی بچے کا منہ لمبا ہے تو اسے لمبے سفر سے مت روکیں ورنہ وہ ''چوز'' بھی ہوسکتا ہے۔

☆ ٹیلیفون صرف کنواروں کی ضرورت ہوتی ہے اگر کسی خاندان میں سب کی شادی ہو جائے تو ٹیلیفون کا ''باجا'' جاتا ہے۔

☆ اگر وہ ہر ''جگہ'' تلاشی لے رہے ہیں تو وہاں (امریکہ) میں تلاشی پر اعتراض بھی نہ کریں۔

☆ اگر کوئی آپ کو سمندر ہی دے دے تو پھر اس سے مچھلی کا تقاضا نہیں کرتے۔

☆ بجلی بند ہونے کی وجہ سے اگر دھوبی رونے ''دھونے'' میں لگ جائے تو وہ کپڑوں کی بجائے اپنے آپ کو ہی De-press کرے گا لہٰذا اس کی یہ پاور آف نہ کریں۔

ہمارے ہاں اب قبرستان میں ''نو واروں'' کے لئے کوئی جگہ نہیں بچی اگر کہیں مل بھی جائے تو وہ مانگ میں اضافے کی وجہ سے گرانی کا شکار ہو چکی ہے اور کسی گونگے کو بغیر کسی پرواہ کے، ایسی ویسی جگہ دفنا دیا جاتا ہے کیونکہ اس نے آگے سے کون سا ''بولنا'' ہوتا ہے لہٰذا اب قبرستانوں کے لیے بھی کوئی رہائشی سکیم کی طرز پر پرائیویٹ ''سوسائٹی'' یا سکیم بنانا پڑے گی جہاں قرعہ اندازی کے ذریعے آسان اقساط میں جگہ میسر آسکے۔

☆.....☆.....☆

''وٹہ سٹہ''

اس بات میں شک نہیں کہ انسان مزید، مفید، جدید کے چکروں سے کبھی باہر نہیں نکلتا۔ شعیب ملک اور ثانیہ مرزا شادی کا اعلان کر کے اپنی سابقہ منگنیوں سے سیٹلرڈ ہو گئے ہیں یہ دونوں اپنے اپنے میدان کے ستارے ہیں اور ستاروں کا ٹوٹنا اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ دل، نشہ اور رابطہ ٹوٹ جائے تو اسے بھی چند لوگ اچھا خیال نہیں کرتے۔ ہر کامیاب مرد کے پیچھے عورت کا ہاتھ! اور اگر عورت کے ہاتھ میں Racket ہو تو کامیابی اس لحاظ سے یقینی ہوتی ہے کہ وہ آئندہ غیر سنجیدہ جرات سے پرہیز کرتا ہے۔ لہٰذا ہمارے اس سٹار کو چاہئے کہ اب وہ کسی اور عورت کی طرف دیکھنے کی بھی کوشش نہ کرے۔ شعیب ملک نے اس مرتبہ بھی اپنا شریک حیات بھارتی چنا ہے محسوس ہوتا ہے، یا تو وہ ہمسایوں کا خیال رکھنے والے ہیں یا پھر انہوں نے کشمیری حریت پسند یاسین ملک کی ''کاوش'' کو اپنے دل و دماغ پر لے لیا ہے اور شاید اسی ''ٹورنامنٹ'' کے پچھلے ''میچ'' کو Tie کرنا چاہتے ہیں کیونکہ یہاں سے سعدیہ ملک اُدھر یاسین ملک کے گھر سدھار گئی تھی۔ اسے کہتے ہیں بین الاقوامی وٹہ سٹہ! میرے علم میں نہیں کہ اس سے قبل کتنے مغل، ملک اور مانیکا وہاں سے ادلہ بدلہ کر چکے ہیں مگر یہ بھی ممکن ہے کہ کچھ اور پاکستانیوں کا داؤ بھی لگ جائے۔ ویسے کرکٹ اور ٹینس میں اکثر بڑے بڑے داؤ لگتے ہیں اور کھیل کے ساتھ سٹہ بھی کھیلا جاتا ہے۔ بغور دیکھا جائے تو ٹینس اور کرکٹ میں کافی چیزیں مشترک ہیں، دونوں کھیلوں کو ایک ہی بال سے کھیلا جاتا ہے، بشرطیکہ ان میں بال ٹھا کرے نہ آ جائے۔ چونکہ ان کھیلوں میں بال کو ''سپین'' بھی کیا جاتا ہے چنانچہ امید ہے کہ بال ٹھا کرے بھی سپین ہو کر اس بندھن سے ذرا دور ہی رہے گا۔ دونوں کھیلوں میں Net کا استعمال ہوتا ہے لہٰذا ان دونوں کو ایک دوسرے پر جال ڈالنے کی بجائے ایک ہی دفعہ جنگلا ڈالنا ہوگا۔ ایک لحاظ سے یہ ایک دوسرے کے ''فسٹ کزن'' بھی محسوس ہوتے ہیں۔ ملک کا مطلب بادشاہ ہوتا ہے جبکہ ثانیہ بھی مغلیہ خاندان کی چشم ''چراغ'' ہے اور چراغ سے چراغ جلایا بھی جاتا ہے قبل ازیں شعیب اختر اور ایشوریہ کی خبریں بڑی عام ہوئیں تھیں، لیکن کسی ایک شعیب نے تو چراغ جلانے کا بیڑا اٹھانا ہی

تھا۔ اگر شعیب ملک کی شادی کامیابی سے انجام پاتی ہے تو یقینی طور پر اسی نوے کروڑ اچار یے گوہا یے اور بھا یے ''کیدو'' اس الزام سے بھی گریز نہیں کریں گے کہ شادی کی تاریخ بھی ''فکس'' تھی۔

شائقین نے ثانیہ کو ٹینس کورٹ میں دیکھا ہے اور دعا ہے کہ وہ اسی کورٹ میں ہی نظر آئے ورنہ دوسری کورٹ تو خواری ہی خواری ہے۔ ثانیہ مرزا کا تعلق حیدرآباد جنوبی سے ہے اور ایک لحاظ سے یہ اچھی بات ہے کہ وہ انبالہ کی رہنے والی نہیں ورنہ سرداروں نے بڑھکیں مار کر ملکوں کو بھی اپنی برادری ثابت کرنے کی کوشش کر دینی تھی۔ پنجاب کے لوگ عام طور پر صحت مند ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کی صحت کے بارے میں دریافت بھی کرتے رہتے ہیں یہاں اگر کوئی شخص اپنی ایک ٹانگ اور بازو سے محروم ہو کر ہسپتال پہنچ جائے تو عیادت کرنے والے اس سے یوں گویا ہوتے ہیں کہ ''اور کیا حال ہے'' بعدازاں اپنی اس بات پر پھوٹ پھوٹ کر ''ہنستے'' بھی ہیں۔ سکھوں کے واقعات، کیفیات اور خرافات سے سارا زمانہ ہی واقف ہے۔ سردار سورن سنگھ بھارت کے صدر اور پیشے کے اعتبار سے بڑھئی تھے الیکشن کے فوری بعد جب وہ ابھی مبارک بادیں لے رہے تھے، انہیں اطلاع دی گئی کہ وہ جلد دہلی پہنچیں کیونکہ کیبنٹ بنانے میں ان کی مشاورت ضروری ہے۔ اس پر انہوں نے فون پہ ایک تاریخی جملہ کہا ''مجھے پیائش بھیج دی جائے میں یہیں سے تیار کروا کر بھیج دوں گا'' شعیب ملک کے سسرالی انبالے والے ہوتے تو اس نے اپنے سسر کو فون کر کے پوچھنا تھا کہ انکل ہم مہندی لگانے کب آئیں۔ جواب ملنا تھا بیٹا! کوئی اور چیز لگا لو ہمارے صحن میں ثانیہ نے مہندی کے تین پودے پہلے لگا رکھے ہیں۔

☆.....☆.....☆

''بصیرت''

نابینا شخص چھوٹی چھوٹی چیزوں کو اپنی ''بصیرت'' کے سبب پورا پورا دیکھ لیتا ہے اور اگر ''بینا'' شخص اپنی بصیرت کھو بیٹھے تو سمجھئے کہ پورا کا پورا نابینا ہے۔ ایک دفعہ ایک نابینا ہاتھ میں چراغ لے کر جا رہا تھا ایک راہی نے سوال کیا کہ اے شخص تیرے ہاتھ میں یہ چراغ کس کام کا۔ اس نے کہا یہ آپ جیسے بینا لوگوں کے دھکوں سے بچنے کے لیے ہے۔ دھکوں سے بچنے کی بصیرت سب سے زیادہ سیاست دان میں ہونی چاہئے بلکہ اس بصیرت کا ذخیرہ اندوز بھی وہی ہونا چاہئے تاکہ مزید دھکوں سے رہائی پا سکے۔ فقط بصیرت کی ذخیرہ اندوزی ہی کافی نہیں بلکہ اس کو استعمال میں لانا بھی ایک دانائی ہے تاکہ لوگوں کو اس سیاست دان کی سیاسی مٹھاس بھی نصیب ہو سکے۔ آپ کے علم میں ہوگا کہ ہر گھر کے کچن میں شکردان ہوتا ہے اگر چینی کی عدم دستیابی کی وجہ سے شکردان میں نمک رکھ دیا جائے تو گھر والے بار بار دھوکہ کھاتے ہیں اگر کوئی سیاست دان اپنی عوام کو اس ''دھوکہ دان'' میں رکھے تو اس کی سیاست سے ''مٹھاس'' ختم ہو جاتی ہے۔ اگر کہیں مکھیاں بھنبھنا رہی ہوں تو اہل نظر یہ بھانپ لیتے ہیں کہ وہ گند پر بھنبھنا رہی ہیں یا قند پر۔ اسی طرح مستند شکاری کے کانٹے کو جیسے ہی مچھلی لگتی ہے اسے تار کے کھینچاؤ سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس کے کانٹے کو مچھلی کی کون سی قسم لگی ہے اسے کہتے ہیں پھانسنے کی بصیرت۔ سیاست میں سیاسی بدحواسی نام کا کوئی لفظ ایڈجسٹ نہیں ہو سکتا اور بدحواسی کے بارے میں میتھیو کہتا ہے:

They never taste who always drink.

They always talk, who never think.

سیاست کے زمینی حقائق بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ یہ گمان کر لیا جاتا ہے کہ زمین بیچ کر الیکشن لڑیں گے اور پھر رکن اسمبلی سے وزیر بن کر زمین واپس الاٹ کروالیں گے یہ بھی ایک مفروضہ اور سیاسی فکر کی کمی ہے۔ جو شخص سیاست میں داخل ہو کر راحت اور شرافت تلاش کرتا ہے وہ وقت ضائع کرتا ہے۔ ریاست سیاست کے بغیر چل نہیں سکتی اور سیاست میں

''بادشاہت'' زیادہ دیر نہیں چل سکتی لہٰذا سیاسی ٹریک پر کسی بھولے بادشاہ کے چلنے کے لیے کوئی جگہ نہیں ہوتی ہاں اسے میدان سے ''بھاگنے'' سے کوئی روک بھی نہیں سکتا۔ اگر کسی مطلق العنان کو کسی سیاسی وجہ سے ملک چھوڑنا پڑے تو اس کے پاس دو ہی راستے ہوتے ہیں یا وہ کالمسٹ بن جاتا ہے یا پھر نفسیاتہ کالمسٹ۔ جس طرح ایک تخلیق کار پیدائشی ہوتا ہے اسی طرح سیاست دان اور لیڈر ہونا بھی ایک پیدائشی وصف ہے جو اثر رسوخ، برادری یا دولت کی بدولت پیدا نہیں ہوتا اور سینس مین کی بصیرت سیاست دان سے بھی دو چند ہوتی ہے۔ سیاست دان کی نظر اپنی پچھلی قید پر ہوتی ہے اور Statesman کی نظر اس بات پر کہ آئندہ اپنے حلقے میں کس کس کو ''قید'' کرنا ہے۔ عرب کے ایک عظیم سیاست دان سے جب سیاست کے بارے میں دریافت کیا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ اگر کسی بدو کے ہاتھ کچے سوت کا دھاگہ دے دیا جائے اور اس کا دوسرا سرا میرے ہاتھ میں ہو تو میں اسے ٹوٹنے نہ دوں۔ جب ہاتھ تنگ ہو جائے تو دماغ کا بھی یہی حال ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ پاکستان کے تمام سابقہ وزیر خزانہ مل کر بھی کسی مزدور کی تنخواہ کا بجٹ نہیں بنا سکتے۔ سیاست میں اکثر اتفاقات ہوتے رہتے ہیں اور نمائندوں کی اپنی ہی پارٹی میں پوزیشن تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ کبھی وہ سٹی کا صدر ہوتا ہے اور کبھی وہ تھانہ سٹی کی حوالات کا ''افتتاح'' کر رہا ہوتا ہے۔ سیاست دان کے پاس اگر جعلی ڈگری بھی ہو تو اسے کم از کم ابن خلدون کی کتاب ''مقدمہ ابن خلدون'' کا مطالعہ ضرور کر لینا چاہئے۔ امتحان میں نقل کرنے پر نوعمر طالب علم پر تین سال کے لیے پابندی لگ جاتی ہے۔ (حالانکہ نوعمر پر کوئی حد نہیں لگا کرتی) لیکن اگر ڈگری ہی جعلی حاصل کر لی جائے تو ساری پابندیاں نقل مکانی کر جاتی ہیں۔ بڑے لیڈر کی ایک خوبی یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ بکھرے ہوئے وسائل کو اکٹھا کر کے ایک عظیم ملک بنا سکتا ہے اگر ریاست کے پاس وسائل کی بہتات ہونے کے باوجود اسے خاطر خواہ استعمال میں نہ لایا جا سکے تو یہ بھی قائدانہ ناکامی ہے اور ناکام لیڈر کباڑیے کی طرح ہوتا ہے اس کے پاس کئی کاروں کا کباڑ ہوتا ہے لیکن وہ اس سے ایک کار نہیں بنا سکتا۔ اصل میں بات تیرتے ہیں پتھر ڈوبتے ہیں اور جو بات کو ڈبونے اور پتھروں کو تیرانے کی کوشش کرے وہ سیاستدان نہیں کہلا سکتا۔

☆.....☆.....☆

سیاسی لیاقت

ہر قبیلہ کی اپنی اپنی پہچان ہوتی ہے اور ہر قبیلہ کوئی نہ کوئی خوبی بھی رکھتا ہے۔ ایشیا میں دو قبائل ایسے ہیں جن کے لطیفے بڑے مشہور ہیں بلکہ ان قبائل کے کچھ لوگوں کے نام ہی ایسے ہوتے ہیں جن کو سن کر کسی لطیفے کا احساس ہونے لگتا ہے۔ یہ قبیلے رنگ برنگے نام رکھنے اور بعد میں اسے بدلنے میں خوشی محسوس کرتے ہیں بھلے یہ ''خالصتان'' ہی کیوں نہ ہو۔ ان میں سے ایک قبیلہ آپ کی سمجھ میں آ گیا ہوگا اور دوسرے کو سمجھنا بھی مشکل نہیں۔ ان کے لطیفے بھی بمشکل سمجھ آتے ہیں اور انہیں سمجھنے کے لیے لیاقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ بعض اوقات انہیں اپنے ہی خلاف بنائے گئے جملے کی سمجھ نہیں آتی اور وہ جملہ لطیفے میں بدل جاتا ہے مثلاً وہ کیا ہے جو مرد کے سر اور عورت کے پیر میں ہوتا ہے ظاہر ہے! لفظ ''ر'' یہ بات بھی خوش آئند ہے کہ لفظ سردار میں یہ دو دفعہ آتا ہے۔

ایک سردار حجام سے: کیا میرے بال تم نے کاٹے تھے؟

حجام: نہیں جناب مجھے دوکان شروع کئے ابھی آٹھ نو ماہ ہوئے ہیں۔

یہ ضروری نہیں کہ لطیفہ، لیاقت کی کمی بیشی سے بنا کرتا ہے بلکہ وقار مجروح کا ذاتی تجزیہ ہے کہ ہمارا ہر فقرہ ہی ''لیاقت'' کا گہوارہ ہے آپ کبھی کسی دفتر فون کریں اور دریافت کریں کہ کیا ادھر لیاقت ہے؟ وہ آگے سے پوچھیں گے کونسا والا بھلوال والا یا بھکر والا۔ یوں اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ دفتر نہیں گویا لیاقت پورہ ہے، آپ یہاں پر ''لیاقت'' کی صدا لگائیں تو ہوسکتا ہے چاروں طرف سے ''ہاں'' کی بازگشت سنائی دے۔ یہی تجربہ کسی تھانے میں کیا جاسکتا ہے کئی دفعہ تو حوالات میں بھی اسی نام کے ایک دو بیٹھے ہوتے ہیں یا اس سے ملحقہ کینٹین میں اس نام کی ایک آدھ شخصیت ضرور مل جاتی ہے۔ بسا اوقات ایسے ایسے مجرم پکڑ لئے جاتے ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے اور پولیس اہلکاروں کی لیاقت کو داد دینا پڑتی ہے، بہرحال یہ وقار مجروح اور لیاقت کا معاملہ ہے۔

گرفتاری مبینہ طور پر تین قسم کی ہوتی ہے، محبت میں گرفتار، مسائل میں گرفتار اور مجرمانہ

فعل میں گرفتار۔ اگر انسان کسی ایک میں بھی گرفتار ہو جائے تو ہر روز ایک نئی مصیبت میں گرفتار نظر آتا ہے۔ بہر کیف لیاقت کا ہر مقام پر فائدہ ہی ہوتا ہے لیکن لیاقت ایسی بھی نہیں ہونی چاہیے کہ جیسے ایک شخص کا لاٹری میں بڑا انعام نکل آیا۔ کمپنی نے احتیاطی اقدام کے طور پر یہ فیصلہ کیا کہ چونکہ انعام بڑا ہے کہیں یہ نہ ہو کہ انعام حاصل کرنے والے کا خبر سنتے ہی انتقال ہو جائے۔ چنانچہ انہوں نے دفتر کے ایک صاحب لیاقت کو اس کے ہاں بھیجا تا کہ وہ طریقے سے اُسے آگاہ کرے۔ نمائندہ اس کے پاس پہنچ کر یوں گویا ہوا "اگر آپ کا کوئی بڑا انعام نکل آئے تو آپ کیا کرو گے" اس نے کہا کہ میں آدھا انعام خبر سنانے والے کو دے دوں گا یہ خوشخبری سنتے ہی نمائندے نے وہیں دم توڑ دیا۔ سیاسی شعبے میں لیاقت، ظرافت اور نقابت کا بہت فائدہ ہوا کرتا ہے۔ کئی لوگ دانش مندی اور لیاقت کے بغیر بھی کامیاب ہونے کی کوشش کرتے ہیں لیکن اس کے بغیر کامیابی اس خون کی طرح ہوتی ہے جس کی مقدار کا پیمانہ تو پورا لیکن اس میں ہیموگلوبن کم ہو۔ بچپن میں ایک واقعہ نظر سے گزرا تھا۔ ایک پرویز نامی شخص کا گھوڑا دوڑ میں ہمیشہ جیتا کرتا تھا۔ اس کا ملازم، جس کا نام اتفاق سے پرویز ہی تھا، گھوڑے کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ ایک دن اسی علاقے کا بشارت نامی شخص جو پرویز کا سخت مخالف تھا اسے ملنے آیا اور اسے گھڑ دوڑ جیتنے پر مبارکباد دی اور کہا کہ جب آپ کا گھوڑا کامیابی حاصل کرتا ہے تو ہمارا سر فخر سے بلند ہو جاتا ہے۔ اس نے مزید کہا کہ اسے خوشی ہو گی کہ اگر وہ اپنی کامیابی میں اس کا بھی حصہ ڈالے۔ بشارت نے پرویز کو کچھ رقم اور ایک شوکت نامی ملازم "تحفے" کے طور پر دیا تا کہ گھوڑے کی زیادہ سے زیادہ خدمت ہو سکے اور وہ مزید کامیابیاں حاصل کر سکے۔ پھر وہی ہوا جو دو ملاؤں میں مرغی کا ہوتا ہے۔ نئے ملازم شوکت نے پرانے ملازم پرویز کو ساتھ ملا کر اپنے ماہرانہ رنگ بکھیرنا شروع کیے، دونوں گھوڑے کے مال سے خوشحال ہونے کے خواب دیکھنے لگے گھوڑا کمزور ہو کر ہارنا شروع ہو گیا اور سیاسی مخالف اپنی "کامیابی" پر خوشی کے شادیانے بجانے لگے۔ چنانچہ وقار مجروح کہتا ہے کہ سیاست میں جھگڑے نہیں ہونے چاہئیں اور اسے لیاقت سے "سلجھانا" چاہیے ورنہ جھگڑے اور چھگڑے کی بریکیں لگانا مشکل ہوتا ہے۔ سیاست جھگڑوں کو ختم کرنے کے لیے کی جاتی ہے بلکہ سیاست تو جھگڑوں کا "جھگڑا" ہی ختم کر سکتی ہے۔

☆.....☆.....☆

سٹیج اور مزاح

کہا جاتا ہے کہ اگر آپ کی آنکھیں خوبصورت ہیں تو آپ کو دنیا اچھی لگے گی اور اگر آپ کی زبان اچھی ہے تو دنیا آپ پر آنکھیں رکھے گی۔ اگر "اسم" ہوتا ہے تو اس کا وجود بھی ہوتا ہے۔ کسی چیز کی خاصیت کی وجہ سے اس کی مانگ ہوتی ہے اور مانگ کی وجہ سے اس کی قیمت طے ہوتی ہے۔ آم میٹھا پسند کیا جاتا ہے اگر آلو میٹھا ہو جائے تو اس کا بھاؤ گر جاتا ہے، اچار کا کھٹا ہونا ہی اس کی خاصیت ہے۔ لیموں بھی جتنا کھٹا ہوگا اتنا ہی گاہک کے "دانت کھٹے" کرے گا۔ جلانے والی اشیاء کو خطرناک سمجھا جاتا ہے لیکن تیزاب جتنا زیادہ جلانے والا ہوتا ہے اتنا ہی بہتر گردانا جاتا ہے۔ کتا جتنا زیادہ بھونکنے اور کاٹنے والا اتنا ہی قیمتی ہوتا ہے اس کی نشانی یہ ہوتی ہے کہ یہ چور اور چوکیدار کو یکساں "پڑتا" ہے اس لئے یہ اپنے مالک کو مہنگا "پڑتا" ہے۔

اسی طرح سانپ جتنا زہریلا ہوگا اتنا ہی دواء بنانے کے لیے مفید ہوگا۔ یہ دونوں کاٹنے میں مشہور تو ہیں لیکن یہ وفادار بھی ہوتے ہیں ایک اپنے مالک کا اور دوسرا اپنی مادہ کا۔ انگریزی کی کہاوت ہے کہ ہر کتے کا ایک دن ہوتا ہے (جب اس بے چارے کو کچلہ دے دیا جاتا ہے) اور ہر سانپ کی ایک مادہ ہوتی ہے جو بعض اوقات لکیر پیٹنے والے کی زد میں آجاتی ہے۔ رنگ کتنے ہی اچھے اور قیمتی ہوں ان کا دشمن رنگ کاٹ بھی بہت کام کی چیز ہے جس کی قیمت سن کر خریدار کا رنگ اڑ جاتا ہے۔ بقول وقار مجروح کوئی ایسا رنگ کاٹ ہونا چاہئے جو ہمارے اوپر لگنے والا دہشت گردی کا دھبہ دھو دے۔

ایک مشہور ضرب المثل ہے کہ زن زر زمین لڑائی کا پیش خیمہ ہوتے ہیں اگر ان میں زبان بھی شامل کر لی جائے تو شاید کوئی بدزبانی بھی نہ ہوگی۔ بدزبان کو کون اچھا سمجھتا ہے لیکن بدزبان، چوکیداری کے لیے سب سے عمدہ شمار ہوتا ہے۔ کم گو انسان عقل مند تصور کیا جاتا ہے لیکن ہمارے سٹیج پر زیادہ سے زیادہ پھل جھڑیاں چھوڑنے والا "فنکار" قرار پاتا ہے۔ بڑے عرصے سے خواہش تھی کہ سٹیج کے فنکاروں پر کچھ لکھوں، ان کی فنکارانہ صلاحیتوں کے اعتراف میں، ان کے ادا کئے ہوئے کچھ جملوں کی کاٹ بھی اپنے قارئین کی خدمت میں پیش کروں۔

میرا خیال تھا کہ ایک آدھ ڈرامہ دیکھ کر ان میں سے کچھ فکاہیہ جملے اپنی تحریر میں شامل کروں گا اور اس طرح ان کی پذیرائی ہو جائے گی لیکن ایک درجن سے زائد سٹیج ڈرامے دیکھنے کے بعد میں صرف چند جملے اکٹھے کر پایا ہوں اس سے یہ بات عیاں ہو گئی ہے کہ سٹیج پر جملے سے زیادہ پرفارمنس کے جوہر ہی نظر آتے ہیں۔ پنجابی، جذبات کے اظہار کے لیے بہت وسیع زبان ہے اور اس میں بولے گئے جملوں کے کئی کئی مطلب نکلتے ہیں اور اسی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے فنکار جو مزاح تخلیق کرتے ہیں اس کا کوئی جواب نہیں ہوتا۔ سٹیج کی ایک فنکارہ یہ جملہ ادا کرتی ہے میرا ساتھ آرام سے بات کرو میرا نام چندا ہے: دوسرا کردار فوراً کہتا ہے جتنا غریب میں ہوں مجھے تو چندا بھی جائز ہے۔

ایک اور کردار دوسرے کے کان میں کہہ رہا تھا کہ میں نے کل وہاڑی کو چھانگا مانگا کے ساتھ دیکھا ہے دوسرا، میں نے بھی کامونکی گوجرانوالا کے ساتھ دیکھا تھا۔ سٹیج کے حاضر دماغ اداکاروں کے لیے سنجے دت کو گنجے دت اور جیکی چن کو امانت چن بنانا مشکل نہیں۔

ایک کردار جو مجرا سننے کے لیے ایک کوٹھے پر آتا ہے اس کا استقبال کرنے والا اس سے یوں گویا ہوتا ہے ''آیئے چودھری صاحب یہاں بیٹھیں اسے اپنا گھر سمجھ کر بیٹھیں''۔

کل ایک آدمی کہہ رہا تھا میں نے آج چودہ دیگیں چڑھانا ہے میں اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا اس نے گھر جا کر بتایا کہ دیگیں چودھویں منزل پر چڑھانا تھیں۔ ایک کردار دوسرے کردار کو کہہ رہا تھا کہ یہ وہ شیر ہے جو کتوں سے کہہ رہا ہوتا ہے کہ لعنت ہو تم پر! اپنی لڑائی میں میرا پاؤں زخمی کر دیا ہے۔

ملازم: چودھری چیچک صاحب ہماری تنخواہ بڑھا دیں۔ چودھری: وہ کس بات کی؟ کیا یہ کم ہے کہ ہم آپ کو چودھری کہتے ہیں۔ بلاشبہ ہمارے سٹیج ڈراموں کا مزاح اچھے مزاح میں شمار کیا جا سکتا ہے۔

☆.....☆.....☆

ہیلری کے حیلے

ہیلری کی پاکستان آمد سے ملکہ برطانیہ کی برصغیر آمد کی یاد تازہ ہوگئی۔ سکیورٹی کی وجہ سے عوام اُس دور میں بھی بہت تنگ ہوئے تھے اور اب بھی ہوئے ہیں۔ دہشت گردی کا خطرہ ان دنوں بھی تھا اور اب بھی ہے۔ برطانیہ کے بارے میں مشہور تھا کہ اس کی سلطنت میں سورج نہیں ڈوبتا، امریکہ کے بارے میں یہ مشہور ہونا چاہئے کہ اس کا دیا ہوا قرضہ نہیں ڈوبتا۔ اسی لئے وہ آج کل ہمارے لئے ''سخی'' کا درجہ رکھتا ہے۔ سخی اگر کسی محتاج کو (بشرطیکہ وہ ماہر اور محتاط قسم کا محتاج ہے) ایک دو باتیں ازراہِ شگفتگی داغ بھی دے تو اسے برا نہیں منانا چاہئے۔ اگر کوئی منگتا، سخی کی باتوں کا بُرا منا جائے تو سمجھ لیں کہ وہ عقل کا محتاج بھی ہے۔ محتاج کو ہاتھ تاکنے کا استادی طریقہ ضرور آنا چاہئے تاکہ وہ کسی بھی سخی کی جیب پر ہاتھ صاف کر سکے کیونکہ اس نے بغیر بُرا منائے اپنی طبع آزمائی جاری رکھنا ہوتی ہے۔ محتاج میں ایک بڑی کمزوری ہوتی ہے جو اسے معاشرے کے ہر پہلو میں کمزور کر دیتی ہے یہ کہ وہ فریاد کرتا ہے فرمائش نہیں۔ لہٰذا اس کے لیے محتاجی، ازدواجی اور سماجی معاملات میں احتجاجی رویے سے اجتناب ضروری ہوتا ہے ورنہ ''سخی'' ناراض ہو جاتے ہیں۔ آجکل سخی ملک کی ایک وزیر ہمارے ہاں مہمان ہے۔ جاذب نظر ہیلری کی جانب سے ہمارے کشکول میں ڈالے گئے دو عدد بیان بھی کسی ''بل'' سے کم نہیں ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ پاکستان اور امریکہ کے تعلقات ایک ازدواجی تعلق کی طرح ہیں لہٰذا اس میں کبھی کبھی سرد مہری بھی آجاتی ہے۔ مگر ہیلری نے واضع نہیں کیا کہ ان دونوں ملکوں میں سے خاوند کون ہے۔ اس ضمن میں دلہن کی کوشش ہونی چاہیے کہ اپنے دولہے کا طرہ بلند رکھے تاکہ طرفہ تماشہ نہ بنے۔ کامیاب خاوند وہ ہوتا ہے جو اپنی بیوی کے خرچے سے بڑھ کر کمانے کی کوشش کرے اور کامیاب عورت وہ ہوتی ہے جو ایسا محنتی خاوند تلاش کرے۔ ایک شخص نے اپنی بیوی کو گھر آکر یہ اطلاع دی کہ اس نے ''خاموشی'' پر مسلسل سات گھنٹے تقریر کر کے پچاس ہزار انعام حاصل کیا ہے۔ بیوی نے کہا بس! اب خاموشی سے پچاس ہزار میرے حوالے کر دو۔ جس طرح خاموشی کی خوبیاں مسلسل بول کر بیان کی جاسکتی ہیں، کیا اسی طرح مانگی تانگی دولت کے مزے

اڑا کر بھی انعام حاصل کیا جا سکتا ہے؟

ہمیں آج تک یہ بھی پتہ نہیں چل سکا کہ ہم دونوں ملکوں میں سے سخی کون ہے اور محتاج کون۔ بجا آوری کی سخاوت میں تو ہم نے کبھی کمی نہیں چھوڑی۔ لیکن ہم میں نجانے کون سی کمی ہے کہ ہم مسلسل محتاج بنتے جا رہے ہیں۔ اگر ہم محتاج نہیں ہیں تو کم از کم طلب گار ضرور ہیں۔ میڈم ہیلری! ایک ٹانگ سے محروم محتاج جب کشکول لیکر نکلتا ہے تو اس کی پھرتیوں سے ارض خدا سمٹ جایا کرتی ہے۔ آپ کے امریکہ جیسے مقتدر ملک سے ہمارا کیا مقابلہ؟ براہ مہربانی ہمارے کشکول کا بھانڈا مت پھوڑیئے اور اس میں کم از کم کشمیر ہی ڈال دیں۔

ہیلری کی ایک اور ہوشیاری اس وقت سامنے آئی جب اس نے دوسرا بیان دے کر کیری لوگر بل کو پاکستان کے کورٹ میں پھینکنے کی کوشش کی اور کہا کہ اب پاکستان پر منحصر ہے کہ وہ امداد چاہتا ہے یا نہیں۔ یہ جملہ دریا دل سخی کی تنگ نظری کو ظاہر کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی سخاوت کو بھی مشکوک کر گیا ہے۔ دیکھا جائے تو یہ بات لڑائی والی بھی ہے لیکن ہم امریکہ کے ساتھ ایسا نہیں کریں گے۔ اگر دنیا میں ہماری لڑائی کسی ملک کے ساتھ ہے تو صرف بھارت سے۔ اس کے برعکس ہم پاکستانی لوگ، لوگر بل اور بل کلنٹن دونوں ہی کو چاہتے ہیں۔ لیکن میڈم ہیلری کیا آپ نے بل کلنٹن کو کبھی کہا ہے کہ کھانا تیار ہے، اب یہ آپ پر منحصر ہے کہ کھائیں یا نہ کھائیں۔ یہ بات تو اس ضرب المثل کی عکاس ہے کہ ''ہاتھ میں دے روٹی اور سر پر مارے سوٹی'' حالانکہ برطانیہ کی ایک شاعرہ میری کہتی ہے:

Wife and servant are the same,

But only differ in the name.

میڈم! یہ تو بہت کم ظرفی ہے آپ کے اس بیان سے وفا کی خوشبو نہیں آئی اور لگتا ہے دوستی کا یہ سارا آشیانہ شاخ نازک پر بن رہا ہے۔ شاخ نازک پر آشیانہ بنانے کا نقصان کلی طور پر آشیانہ بنانے والے کو ہی ہوتا ہے۔ شاخ کو کبھی کوئی اعتراض نہیں ہوتا کہ کوئی اس پر آشیانہ بنائے یا نہ بنائے۔ ہیلری! کیا آپ میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی امریکہ پہنچ چکیں؟

☆.....☆.....☆

اُمید

امید ایک ایسی ''بیماری'' ہے جو صبح، آنکھ کھلتے ہی اپنا اثر دکھانا شروع کر دیتی ہے۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ امید ایک اچھا ناشتہ ہے لیکن یہ بدترین ظہرانہ ہے۔ امید جب پھوٹتی ہے تو کوئی گرد بھی نہیں اڑتی۔ ایک غیر ملکی مفکر اُمید دلاتے ہوئے کہتا ہے:

Oh! let us never, never doubt
What nobody is sure about!

امید اندر ہی اندر اپنا کام اس وقت تک دکھاتی ہے جب تک نتیجہ ظاہر نہ ہو جائے۔ یہ غلط فہمی ہے کہ صرف خواتین ہی امید سے ہوتی ہیں حالانکہ مرد بے چارہ تو ہر روز کئی مرتبہ امید سے ہوتا ہے۔ مرد کو جتنی فکر اپنے کنبے کے پیٹ کی ہوتی ہے شاید اتنی عورت کو اپنے مرد کے کھانے کی نہیں ہوتی۔ نتیجتاً مرد کی اس Pain کا علاج کسی ڈاکٹر کے پاس بھی نہیں ہوتا۔ ایک ذمے دار مرد کی یہ خوبی ہوتی ہے کہ وہ اپنے گھر والوں کا پیٹ خوشیوں سے بھرا رکھتا ہے، چنانچہ امید کے پاپڑ بیلنا اس کا ایک مسلسل مشغلہ ہوتا ہے اور وہ بیلنا ساری عمر اپنے ہاتھوں سے الگ ہونے ہی نہیں دیتا، ورنہ اس کی ساری امیدیں ہی دم توڑ جائیں۔ یہ میرا گمان ہے کہ اگر مرد اُمید سے پُر نہیں ہوتا تو کم از کم نیم اُمید سے ضرور ہوتا ہے اس لئے زمانہ ہر لمحے، اس کی آرزوؤں کا استقاط جاری رکھتا ہے۔ تجربے میں آیا ہے کہ جب کوئی امید سے ہوتا ہے تو وہ پہلے سے زیادہ طاقت ور ہو جاتا ہے۔ کسی کے اندر پیدا ہونے والی امید اسے طاقت ور بناتی ہے اور مجسم ہو کر سامنے آنے کی جستجو میں مزید زور آور ہو جاتی ہے۔ طاقت ور ہونا ایک علیحدہ بات ہے لیکن نڈر ہونا ایک علیحدہ پہلو ہے۔ تجربے میں آیا ہے کہ زیادہ تر بھاری بھرکم افراد بزدل ہی پائے گئے ہیں۔ ولیم کاپر کہتا ہے جسے کوئی امید نہیں ہوتی اسے کوئی ڈر بھی نہیں ہوتا حالانکہ جس طالب علم کو فیل ہونے کی امید ہو وہ گھر سے باہر نکلتے ہوئے بھی گھبراتا ہے۔ بے روزگار شوہر کی بیوی تو بے وقت کئی امیدوں سے ہوتی ہے اسے توقع ہوتی ہے کہ میرا خاوند جب بھی قبل از دوپہر سو کر اٹھے

گا تو اس کے لیے روٹی پانی کا بندوبست ضرور کرے گا۔

قرض خواہ کو یہ امید ہوتی ہے کہ اسے مقروض سے جلد از جلد قرض واپس مل جائے گا۔ مسافر اس امید سے ہوتا ہے کہ وہ پاکستان ریلوے سے ایک "برتھ" ضرور حاصل کر لے گا۔ اسی طرح بے روزگار اس امید سے ہوتا ہے کہ وہ جلد ہی روزگار کو اپنا "برخوردار" بنا لے گا۔ دوسری طرف بے چارہ غریب کسان تو صرف گھاس کاٹ کر ہی اپنی گود ہری کر لیتا ہے اور اکثر رنگے ہاتھوں دھر بھی لیا جاتا ہے۔ تھانے دار اور وکیل اس امید سے ہوتے ہیں کہ کل صبح انہیں قتل کا کیس ضرور مل جائے گا اور پھر ان کے وارے نیارے ہو جائیں گے۔ ویسے بھی قانون مکڑی کے جالے کی طرح ہوتا ہے اس میں مکھیاں تو پھنس جاتی ہیں لیکن کبھی مچھر نہیں پھنستی۔ استثناء اپنی جگہ لیکن قانون میں ضرورت ایجاد کی ماں والی ضرب المثل ضرور صادق آتی ہے۔ چنانچہ اسی قانون کے تحت، اگر کسی مقدمے کا سر چھوٹا اور پیر بڑے ہوں تو اسے پینٹ لازمی طور پر، سر کی طرف سے پہنا دی جاتی ہے۔ ڈاکٹر محمد یونس بٹ کو اگر اپنے اگلے کھیل کے آئیڈیا کے بارے میں تھوڑا سا تو لیڈی گمان پیدا ہو تو وہ بھی قوی امید سے ہو جاتے ہیں۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ان کے جملے بھی Premature محسوس نہیں ہوئے اور امید سے ہوتے ہی انکی مراد بھی پوری ہو جاتی ہے۔ لیکن المیہ یہ ہے کہ ہماری حکومتیں ہمیشہ آبادی کو کنٹرول کرنے پر زور دیتی رہی ہیں اور پلاننگ کمیشن کی امید کو سبز ستارے اور چابی والے ٹیکے لگاتی رہی ہیں لیکن بدقسمتی سے یہ ٹیکے زیادہ تر ڈیموں، بجلی پیدا کرنے والے منصوبوں اور جمہوری اداروں کو لگتے رہے ہیں اور ہمیشہ ان کو میٹھی مراد سے محروم رکھا گیا ہے۔ اس "عمل" سے صرف سوال ہی پیدا ہو سکتے ہیں اور کچھ نہیں۔ پاکستانی بھائیوں سے خصوصی درخواست ہے کہ امید اور صبر کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ چھوڑیں اور صرف یہ پیدا کر لیں جس کا علامہ اقبال نے حکم دیا ہے کہ

فضائے بدر پیدا کر فرشتے تیری نصرت کو
اتر سکتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار اب بھی

☆.....☆.....☆

جھوٹے

امریکیوں کے رویے سے محسوس ہوتا ہے کہ یہ مشہور ضرب المثل جلد خدا کو پیاری ہونے والی ہے کہ ''سچ کو آنچ نہیں۔'' مورخہ 17 مئی 2010ء کو ارشاد احمد عارف اپنے ''کالم جھوٹ امریکی کلچر کا جزو لاینفک'' میں ایک سروے کا حوالہ دیتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ امریکی دنیا میں سب سے زیادہ جھوٹ بولتے ہیں ان میں سے 91 فیصد باقاعدگی سے جھوٹ بولتے ہیں اور باقی 9 فیصد جھوٹ بولے بغیر ایک ہفتہ بھی نہیں نکال سکتے اور امریکی جن سے محبت کرتے ہیں ان سے زیادہ جھوٹ بولتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ جھوٹا کبھی ترقی نہیں کر سکتا حالانکہ چور پھر کر لیتا ہے وہ سائیکل چور سے کار چور بن سکتا ہے اگر وہ کام چور نہ ہو۔ بقول وقار مجروح اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ امریکی اپنے بچوں کی اندھی محبت میں گرفتار ہو کر یہاں تک کہہ دیتے ہونگے کہ ہم تمہارے ''ڈیڈی'' ہیں۔ خدا جھوٹ نہ بلائے اگر آپ واقعی سفید جھوٹ کو مجسم دیکھنا چاہتے ہیں تو کسی امریکی سیکرٹری کو دیکھ لیں۔ ان کا ہر نئی مون پہلا اور شادی آخری ہوتی ہے اس لئے یہ پہلا اور آخری کام ہمیشہ جاری رکھتے ہیں۔ انہیں سونا پہننے کا شوق ہوتا ہے اور وہ بھی ''جھوٹا''۔ امریکیوں نے پتا نہیں کس کا ''جھوٹا'' کھایا ہے اور ہم میں سے کچھ لوگوں نے ان کا۔ رابرٹ لوئس کہتا ہے: ''دنیا کا سب سے خطرناک جھوٹ خاموشی سے بولا جاتا ہے'' اس سے ظاہر ہوا کہ امریکیوں کی خاموشی بھی گناہ کے زمرے میں آتی ہے۔

دنیا کے تمام خطوں کے لوگ جھوٹ کو اچھا نہیں جانتے، اس لئے وہ اسے جلدی جلدی بول کر جان چھڑا لیتے ہیں لیکن امریکیوں کو اس ''سماجی'' فرض کی ادائیگی میں چنداں جلدی نہیں ہوتی۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ جھوٹ بولنے کے لیے مختصر جملے کی ضرورت ہوتی ہے۔ بس ''ہاں'' اور ''نہیں'' سے نہایت ''جامع'' جھوٹ بولا جاسکتا ہے جبکہ ہاں اور نہیں کی تشریح کرنے کے لیے آپ کو سو سو جھوٹ بولنا پڑتے ہیں۔ ذرا غور فرمائیں امریکہ کا آئین بھی صرف تین چار صفحات کا ہے لیکن اس کی تشریح سو سے بھی زائد والیم کرتے ہیں۔ ویسے مختصر آئین کا یہ فائدہ ضرور ہوتا ہے کہ اس میں سچی جھوٹی ترامیم کی ضرورت نہیں پڑتی۔ ایک امریکی سے پوچھا گیا کہ

آپ کو سچ بولے کتنا عرصہ ہوا ہے امریکی نے بغیر برا منائے کہا تم مجھے امریکی نہیں Settler لگتے ہو کیونکہ امریکی ایسے بھونڈے سوال نہیں کرتے۔ اگر کوئی امریکی کسی چینی سے سب سے بڑا جھوٹ بولے گا تو وہ یہی کہے گا کہ ''ہم سپر پاور ہیں۔'' امریکی باقی ممالک کی نسبت اتنے صفائی پسند نہیں لیکن جھوٹ بڑی صفائی سے بولتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ بات کو پہلے تولو پھر بولو اگر بولنا ہی جھوٹ ہو تو پھر ترازو بھی امریکی کمپنی کا ہونا چاہئے۔ اگر کوئی اطالوی جھوٹ بول رہا ہو تو اس کے ہاتھ حرکت کر رہے ہوتے ہیں اور بھارتی پورے کا پورا حرکت میں ہوتا ہے۔ امریکی کے جھوٹ بولتے ہوئے صرف ہونٹ ہل رہے ہوتے ہیں اور اگر پاکستانی جھوٹ بولے تو پورے علاقے کی پولیس حرکت میں آجاتی ہے۔

عراق میں امریکہ کی جمہوریت یا کیمیاوی ہتھیاروں کی بازیابی کیلئے، افغانستان میں اسامہ کی گرفتاری کے لیے اور ویت نام میں ایک جھوٹے دعوے کے ذریعے آمد نے امریکیوں کی ''سچائی'' کے پول کھول دیے ہیں اس سے ثابت ہوا کہ وہ صرف ''سچے'' دشمن ہوتے ہیں۔ ہم نے سنا تھا کہ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے لیکن امریکی صرف ایک جھوٹی کال پر اپنے دوستوں کے پاؤں تلے سے زمین نکال دیتے ہیں۔ امریکہ دنیا کے کئی ملکوں کی Mother Country ہے اگر ماں جھوٹ بولے گی تو پھر ''بچے'' جھوٹ کو ٹربو انجن لگا دیں گے۔ ایک امریکی مصنفہ میکارتھی اپنے ہی بارے میں کیا ''سچی'' بات کہتی ہے: Every word she writes is a lie, including "and" and "the". ہمارے ساتھ امریکیوں نے عہد شکنی اور جھوٹ کے اتنے ریکارڈ قائم کئے ہیں کہ شاید ہی کسی ملک کے ساتھ کئے ہوں۔ مسئلہ کشمیر ہو یا ایف سولہ کی ترسیل کا وعدہ سب کے سب ساتویں بحری بیڑے کے مترادف ثابت ہوئے ہیں۔ دوسری طرف یہ بات بھی اہم ہے کہ اگر کسی سچ سے نفاق اور فتنہ پھیلے تو یہ جھوٹ سے بھی ہزار درجے خطرناک ہے اس لئے مولانا روم نے صدیاں پہلے فرما دیا تھا کہ ''دروغ مصلحت آمیز بہ از راستی فتنہ انگیز'' یعنی جس سچ سے فساد بڑھے اس سے وہ جھوٹ بہتر ہے جس سے فساد مٹے۔

☆.....☆.....☆

چھٹکارہ کیسے!

چوروں سے چھٹکارہ شاید آسان لیکن کام چوروں سے بہت مشکل ہے۔ جونہی کام کے لیے کہا جائے انہیں پسو پڑ جاتے ہیں لہٰذا پہلے ان پسوؤں سے چھٹکارہ ضروری ہے تاکہ کام چوروں کے پاس کوئی بہانہ نہ رہے حالانکہ پسو کبھی ایسے کام چور نہیں ہوتے کہ اگر یہ کسی کو پڑ جائیں تو حرام خور کی نیند بھی حرام کر دیتے ہیں اور انہیں ہر وقت چھپ کر اپنے حملے جاری رکھنا ہوتا ہے۔ خون چوس کر بھی انہیں کبھی سر اٹھا کر چلتے نہیں دیکھا گیا مگر پسوؤں کو کوئی شئے پلا کر ہلاک کرنا مشکل ہوتا ہے کیوں کہ یہ خون کے علاوہ کچھ چکھتے ہی نہیں لہٰذا ان پسوؤں کے لیے موت کا پیغام لانا کسی کام چور کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ کسی دوسرے سے کام لینا بھی چونکہ محنت طلب ہے چنانچہ اس آرٹ میں بھی کام چور کام یاب نہیں ہوتا۔ اس کا دماغ ہماری ریلوے کی طرح سست نہیں ہوتا تبھی تو وہ حاضر دماغی سے کام لیکر کام چوری کا شغل جاری رکھتا ہے۔ ہمارے معاشرتی کام چوروں کو کم از کم پسوؤں سے ہی سبق حاصل کرنا چاہئے جو انہیں کام یابی سے جا پڑتے ہیں اور خون چوسنے کے حوالے سے کام چوری کے مرتکب بھی نہیں ہوتے۔ دیکھنے میں آیا ہے کہ لوگ قد میں اضافے کے لیے ہلکان ہوئے جاتے ہیں حالانکہ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ لبوں کو بے وقوف بنانے کے لیے اپنے دماغ سے زیادہ کام بھی نہیں لینا پڑتا۔ چار انچ اونچائی کا ہیٹ اور چار انچ کی ڈبل سٹوری ہیل کے استعمال کی بجائے اگر کسی ''ضرورت مند'' کی مدد کر کے معاشرے میں قد آور شخصیت کے طور پر ابھرا جائے تو دوسروں کو بے وقوف بنانے میں بڑی آسانی رہتی ہے کیونکہ معاشرتی قد آور جسمانی چھ فٹوں کو چند منٹوں میں منفی چھ فٹ بنا دیا کرتا ہے۔ چیف جسٹس (ر) نسیم حسن شاہ ایک قد آور شخصیت کے طور پر ابھرے لیکن ایک تو ہم پرست گروہ انہیں قد آور تسلیم کرنے کو نہ کل تیار تھا اور نہ اب ہے۔ ایک تجربہ کر لیجئے مکھی کی عمر دو تین دن ہوتی ہے لہٰذا قد بڑھانے کی دوا استعمال کرنے سے قبل اسے گھریلو مکھیوں کے آگے ڈال دیں، مرنے سے قبل اگر وہ کوؤں کی صورت آپ پر حملہ کریں تو سمجھ لیں آپ کو دوا کے استعمال سے ضرور فائدہ ہوگا۔ اگر آپ گھر میں صرف میٹھی باتیں کریں

گے تو لازمی بات ہے گھر میں کبھی مچھروں کی بہتات ہونے لگے گی اور وہ آزادانہ کھلے منہ پر قبضے کرنے کی کوشش کریں گی۔ لہٰذا ان کو بھگانے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ گھر میں ایک آدھ گھنٹہ جنگ و جدل کریں تاکہ کھیاں اور دوسری آفات و بلیات آپ کے گھونسوں کی زد میں آ کر تباہ و برباد ہو جائیں۔ موجودہ بے یقینی کے دور اور ماحول کے مطابق تو اپنے گھر کے ماحول کو پھٹا پھٹا رکھنا ناگزیر ہو گیا ہے اور اگر ایسا ممکن نہیں تو گھر کے افراد کو پھٹی پھٹی نظروں سے ضرور دیکھیں۔ اگر گھر میں کبھی دودھ پھٹ جائے تو ایک لحاظ سے یہ اچھی بات ہے اور آپ خوش قسمت ہیں کہ آپ اصلی دودھ کا استعمال کر رہے ہیں۔ واقعی اگر دودھ پھٹ جائے تو فوراً دودھ والے پر پھٹ پڑیں اور اس سے دودھ کے بدلے دودھ کا تقاضہ کریں اور ایکشن سے پہلے یہ غور کر لیں کہ کہیں اس نے بارودی جیکٹ تو پہن نہیں رکھی۔ اگر کسی کا لباس دیکھ کر جلن ہو تو فوراً اپنے اوپر پانی ڈال کر شیشے کے سامنے کھڑے ہو جائیں اور اپنے آپ سے کئی سوال کریں اور آخر میں ایک سوال یہ بھی کریں کہ کیا ان کپڑوں کے قابل بھی ہو؟ ویسے جیلسی کا جلا کسی جیلی سے بھی ٹھیک نہیں ہوتا اور اگر کوئی مکمل جل جائے تو خواہشات کی راکھ سر میں ڈال کر اسی کے پاس واپس آئیں، جس نے بیمار کیا۔

☆.....☆.....☆

کانوں کا صفایا

کان چاہے کتنے ہی بڑے کیوں نہ ہوں ان کی سماعت کی کوئی ضمانت نہیں ہوتی یہاں تک کہ انسان کو ڈائریکٹ کی گئی بات سنائی نہیں دیتی اور کسی دوسرے کے کانوں کو کام میں لایا جاتا ہے جو بات سن کر انہیں پہنچانے کا بیڑا اٹھاتے ہیں مگر اصل موضوع کا بیڑا غرق کر دیتے ہیں، اسی لئے ''ڈائریکٹ، ان ڈائریکٹ'' بچپن میں ہی سکھا دیے جاتے ہیں تاکہ بڑھاپے میں کچھ تو پلے پڑ جائے۔ آج کل کانوں کی جتنی ضرورت محسوس ہوتی ہے اتنی پہلے کبھی نہ تھی موبائل فون کی ایجاد اس کا اہم سبب ہے حتی کہ ہینڈ فری کا تعلق بھی کانوں سے ہی ہے اگر گھر میں بھی کانوں پر ہینڈ فری لگی نظر آئے تو بچے بھی ہینڈ فری دکھائی دیتے ہیں۔ محفل میں کئی دفعہ کانوں کی کمزوری کی وجہ سے شرمندگی اٹھانا پڑ جاتی ہے چنانچہ انسان اگر صفائی پسند نہ بھی ہو پھر بھی شرمندگی سے بچنے کے لیے عطائیوں سے کان کی صفائی کروانا اس کے معمولات میں شامل ہو جاتا ہے لیکن کچھ لوگ ان کی صفائی بھی کارپوریشن کے کھاتے میں ڈالنا چاہتے ہیں بلکہ کانوں کی صفائی اس حد تک کر گزرتے ہیں کہ وہ کنکھجورے کے لیے گویا موٹروے بن جاتے ہیں بالآخر یہ خود ساختہ مریض اپنے کانوں کو ہاتھ لگاتا ہے کہ وہ آئندہ ایسا نہیں کرے گا۔ یہ امر ایک لحاظ سے بہتر ہے کہ کان کی صفائی باہر سے ہو جاتی ہے البتہ ان کا سائز کوئی بھی ہو عطائیوں کی جانب سے ان کی صفائی کا ایک ہی ریٹ ہوتا ہے فرق صرف یہ کہ اسے صفائی کی بجائے ''سروس'' کا نام دے دیا جاتا ہے۔ لوگ اپنے کسی محسن کے لیے آنکھیں بچھانے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں لیکن اس کام کے لیے اپنے کانوں کو ریڈ کارپٹ بنانے کا خطرہ مول نہیں لیتے۔ عطائی کے ہاتھ میں لمبی سلائی سے یہ ڈر بھی درپیش رہتا ہے کہ یہ کانوں کا سوراخ کھولتے کھولتے کہیں دل میں سوراخ نہ کر دے اور اگر ذرا سی بے احتیاطی سے ایسا واقعہ پیش آ جائے تو پھر ان کے کانوں کو مونچھوں کے ساتھ مڑوڑنا بھی فرض ہو جاتا ہے۔ اکثر عطائی اس ہنر میں بھی یکتا ہوتے ہیں کہ آپ کے کان E.N.T سپیشلسٹ کے خلاف بھی بھر دیں گے۔

اکثر لوگوں کو کانوں کی کمزوری کی شکایت ہو جاتی ہے لیکن وہ طبیب کے سامنے بھی ان پر

"پردہ" ڈالنے کی کوشش میں ہوتے ہیں لیکن بالآخر وہ چاک ہو کر رہ جاتا ہے۔ اگر کسی وجہ سے کان کا پردہ چاک ہو جائے تو وہ دوا اثر پر دف نہیں رہتا۔ ایک شخص ڈاکٹر کے پاس گیا اور شکایت کی میری بیوی کو کسی بیماری نے آلیا ہے اور اسے مجھ سے بات کرتے ہوئے اونچا بولنا پڑتا ہے۔

عورتوں کا کان کی صفائی سے کوئی سروکار نہیں ہوتا، آپ نے ان کے کانوں کے متعلق شکایات بھی کم ہی سنی ہوں گی حالانکہ ان کا سولہ سنگھار کانوں کی سجاوٹ کے بغیر مکمل ہی نہیں ہوتا۔ دوسروں کی باتیں کھولتے ہوئے ان کو اندازہ ہی نہیں ہوتا کہ جس طرح دیواروں کے کان ہوتے ہیں اس طرح دروازوں کی زبان بھی ہوتی ہے۔ کانوں کا دل سے بہت قریبی تعلق ہوتا ہے دل کی دھڑکن ان کے ذریعے بھی سنی جاسکتی ہے اور کانوں کے ذریعے ہی باتیں دل کو بھاتی ہیں، دل کانوں پر بڑی آنکھ رکھتا ہے لیکن دل کے ڈاکٹر سے معائنہ کروانے کے لیے مریض کو پہلے ٹھنڈے دل سے سوچنا پڑتا ہے کیونکہ اگر ہسپتال سے دل اٹھ جائے تو کبھی اپنی اصلی حالت پر واپس نہیں آتا اگر کان کمزور ہو جائیں تو دل پر پتھر رکھ کر کان پر آلہ سماعت دھرنا پڑتا ہے۔ کان کھانے والے "بے ضرر" لوگوں کے متعلق آپ نے سنا ہوگا لیکن اگر کسی کے ہاتھ سونے کی کان لگ جائے تو وہ ملک وقوم کے لیے کتنی ضرر رساں بات ہوگی، اس کا اندازہ کرنا محال ہے۔

☆.....☆.....☆

''پیار سے مار''

پیار مار کی ضد ہے اور جو ضد کرے اسے یا تو مارا جاتا ہے یا پھر پیار سے منایا جاتا ہے۔ اس پیار اور مار کے درمیان صرف خاموشی رہ جاتی ہے جس سے آج تک کوئی مسئلہ حل نہیں ہو سکا۔ انگریزوں نے جہاں حکومت کی وہاں یہی شور مچایا ''خاموشی'' کئی دفعہ خاموشی کے بارے میں درس دیتے انہیں سارا سارا دن بھی ''بولنا'' پڑا۔ خاموشی بھی کیا اچھی چیز ہے جس کے درس گھنٹوں سنے گئے اور بولے بھی فرنگی۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب برصغیر ریمنڈ ڈیوسوں سے بھرا پڑا تھا۔ گوروں نے ہی ہمیں موجودہ نظام تعلیم بھی دیا جس میں تربیت کے لیے ڈنڈے کا استعمال عام تھا۔ انگریز کی دیگر نشانیوں کے ساتھ ساتھ یہ نشانی اب بھی ہمیں نظر آ ہی جاتی ہے۔

جب بھی کسی سرکاری سکول میں داخل ہوں آپ کو سکول کی در و دیوار پر ایک اخلاقیات بھرا یہ جملہ دیکھنے کو ملے گا ''مار نہیں پیار'' ظاہر ہے یہ جملہ بچوں کے لیے تو لکھا نہیں ہوتا اور جن کے لیے لکھا ہوتا ہے وہ بھی پڑھے نہیں ہوتے۔ سوال یہ ہے کہ تعلیمی اداروں میں یہ تھانوں والا جملہ لکھنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی۔ بقول وقار مجروح مارنا کسے نہیں اور پیار کسے کرنا ہے یہ دنیا کے کسی سلیبس میں درج نہیں۔ اگر ''مار نہیں پیار'' کا انگریزی ترجمہ ''Love no Lash'' کر دیا جائے تو شاید ہمیں کئی پابندیوں کا بھی سامنا کرنا پڑ جائے۔ سکولوں میں جگہ جگہ یہ جملہ لکھ دینا کہ اس سے تعلیمی اداروں سے تشدد کو مار بھگا دیا جائے گا کسی محکمے کی سادگی کے سوا کیا ہے کہ ہر طرف یہ جملہ لکھا ہوتا ہے یہ سٹاف کی نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ اس کی ایک وجہ شاید یہ ہے کہ کچھ ذمہ داروں کو ابھی بھی مار ہی سے پیار ہے یا پھر ڈنڈے سے۔ ہمارے سرکاری سکولوں میں اب بھی سبق یاد نہ کرنے پر ایسا سبق دیا جاتا ہے جو کبھی نہیں بھولتا اور حساب کا سوال نہ کرنے پر حساب بیباک کر دیا جاتا ہے، جو تاریخ کا سبق یاد نہ کرے اسے تاریخ کا حصہ بنا دیا جاتا ہے اور جو کبھی بھول کر چھٹی کر لے اسے چھٹی کا دودھ یاد آ جاتا ہے۔ غیر ملکی اس نئے جملے کو دیکھ کر سکول میں ''داخلے'' سے ہی گھبراتے ہیں۔ ہمارے اساتذہ اگر صرف تعلیم سے پیار کریں تو تشدد خود بخود ختم ہو جائے گا کیونکہ تشدد کے پیچھے بھی مختلف محرکات ہوتے ہیں چلیں اگر وہ مار

کے بعد ہی پیار کرلیں تو اس عبارت کا حق ادا ہوسکتا ہے۔ کئی ماسٹروں کو غلط فہمی ہوتی ہے کہ مار کے بغیر مستقبل کے معمار پیدا نہیں ہوسکتے حالانکہ وہ خود اس عمل سے گزر چکے ہوتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ان لوگوں کا ڈنڈے سے پیار کیسے چھڑایا جائے۔ دوسری طرف کئی بچے بھی ذرا شرارتی ہوتے ہیں لیکن عملی زندگی میں وہی بہتر ثابت ہوتے ہیں اور انہیں پیار کی مار کی ضرورت ہوتی ہے ذرا سی بات پر مارنا کوئی معرکہ مارنا نہیں ہوتا۔ ٹیچر نے بچے سے پوچھا تم دادی کی سالگرہ پر انہیں کیا گفٹ کرو گے؟ بچہ بولا فٹبال کیونکہ انہوں نے مجھے بھی کتابیں گفٹ کی تھیں۔ ایک بچے نے الجبرا کو ایسے خط لکھا کہ ''اب بڑے بھی ہو جاؤ اور اپنے ''مسئلے'' خود حل کیا کرو۔ ایک فلسفی کے بقول مار اور پیار کا عمل گھر سے شروع ہوتا ہے اور سکول کسی طرح گھر سے کم نہیں ہوتا۔ یہاں ایک واقعہ یاد آ گیا۔

پروفیسر: برائی کیا ہے۔ شاگرد: سر پہلے میرے سوال کا جواب دیں کہ کیا سردی واقعی ہوتی ہے۔ پروفیسر: ہاں۔ شاگرد: غلط سر یہ تو گرمی کی عدم دستیابی کا نام ہے۔ کیا اندھیرا ہوتا ہے۔ پروفیسر: ہاں کیوں نہیں۔ شاگرد: سر یہ بھی غلط جواب ہے۔ اندھیرا کوئی شئے نہیں یہ روشنی کی عدم دستیابی کی حالت کا نام ہے کیونکہ ہم فزکس میں صرف روشنی اور گرمائش کا مطالعہ کرتے ہیں اندھیرے اور سردی کا بالکل نہیں۔ اسی طرح برائی کا کوئی وجود نہیں یہ خدا پر ایمان اور محبت کی عدم دستیابی کی حالت کا نام ہے۔ طالب علم کا نام تھا البرٹ آئن سٹائن۔ اگر اسی بات کو سامنے رکھا جائے تو نفرت بھی کوئی شئے نہیں دراصل یہ پیار کی عدم دستیابی ہے۔

☆.....☆.....☆

ہل چل

ذوالفقار مرزا نے اپنے سر پر قرآن رکھ کر پریس کانفرنس کر کے ایک عجیب روایت ڈال دی ہے تاہم اس کی مذہبی حیثیت کے بارے میں علماء ہی صحیح بتا سکتے ہیں۔ انہوں نے صحافیوں کے ہر سوال کا مکمل جواب دیا اور اگر انہیں کسی سوال کے جواب دینے میں کہیں کوئی کمی بیشی محسوس ہوئی تو وہ جوابات کے ساتھ استعفیٰ بھی دیتے گئے۔ کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ شاید مرزا صاحب ''لائی لگ'' ہیں اور کسی تیسری طاقت کے چکر میں آ گئے ہیں لیکن ایسا نہیں۔ لائی لگ (Credulous) کے صرف ظاہری کان ہوتے ہیں اور وہ بھی کچے اور دماغ کی جگہ خالی ہوتی ہے۔ وہ ہر سچی جھوٹی بات کو پلے باندھنے کی کوشش کرتا ہے، خود کش حملہ آور بھی اسی کنبے سے تعلق رکھتے ہیں۔ انسان کے ہر کام میں اصل اہمیت اس کی نیت کی ہوتی ہے۔ نیت سے یاد آیا، کئی مستریوں کی نیت بڑی خراب ہوتی ہے اور اس خرابی کو دور کرنے کے لیے انہیں ایک ایسے مستری کی ضرورت ہوتی ہے جو اس کے دل کی مشین میں چھپا جارج بش نکال سکے۔ کئی دفعہ انسان حالات کے حصار میں ایسا پھنستا ہے کہ دوسروں کو یہ کہنے پر بھی مجبور ہو جاتا ہے کہ آپ نے سچ کہا میں جھوٹا ہوں لیکن مرزا صاحب کی طرف سے لگائے گئے الزامات کا جواب دینے کے لیے بھی ان کی طرف سے ڈالی گئی روایت کو قائم رکھنا ہوگا ورنہ کوئی یقین نہیں کرے گا۔

دانتوں کی حفاظت ضروری خیال کی جاتی ہے چاہے یہ اصلی ہوں یا نقلی اور انہیں نکالتے ہوئے اردگرد کے ماحول پر نظر رکھنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ گورباچوف نے کہا تھا کہ چمکتے دانتوں کے ساتھ ہمیشہ مسکراتے رہنا سیاست دان کے لیے ضروری ہے اگر اس کے دانت سٹیل کے ہوں۔ یہ بات تو ویسی ہی ہوگئی کہ ایک ڈینٹل سرجن نے لکھوا رکھا تھا ''یہاں دانتوں کی ہر بیماری کا دندان شکن جواب دیا جاتا ہے'' والٹیر کہتا ہے کہ دانت، بال اور آئیڈیاز گننے چنے ہی ہوتے ہیں اور وقت کے ساتھ یہ بھی گھٹتے چلے جاتے ہیں کہ ان کے دن پورے ہو جاتے ہیں۔ دن پورے ہونا بھی ایک عجیب بات ہے کئی لوگوں کو شادی اتنی ناموافق آتی ہے کہ شادی کے دن رکھتے ہی ان کے دن پورے ہوتے دکھائی دینے لگتے ہیں اور بقیہ زندگی دل پر پتھر رکھ کر

گزارنا پڑتی ہے۔ دل پر پتھر رکھنا بھی ایک عجیب شغل ہے اگر دل کے ڈاکٹر کا دماغ عرش پر ہو اور وہ دل پر پتھر رکھ کر مریض کا معائنہ کرے تو اس کا دل بے قابو ہوسکتا ہے۔ ہاتھوں کا کردار بھی کئی جگہ بڑا اہم ہوتا ہے کئی دفعہ انسان کو دل کے ہاتھوں موت آلیتی ہے اور کئی دفعہ موت کو دونوں ہاتھوں سے گلے لگالیا جاتا ہے۔ اگر مریض کے دل کی دھڑکن تیز ہو رہی ہو تو اسے بے دھڑک ڈاکٹر کے پاس جانا چاہیے ویسے دل کے ڈاکٹر کو دل گردے والا ہونا چاہئے ورنہ مریض اپنا دل چھوڑ دیتا ہے اور اگر لواحقین ساتھ ہوں تو وہ اپنا دل تھام لیتے ہیں چنانچہ ایسے ڈاکٹر کے پاس نہ کوئی مشورہ لینے والا ہوتا ہے نہ دینے والا۔ دوسروں کو مشورہ دینا بھی ایک آرٹ ہے جسے باقاعدہ ایک ہنر کے طور پر سیکھنا ضروری ہے ورنہ دیئے گئے مشورے پر اپنے مشورے کا اعتراض یا ''ٹیگ'' یا لگا کر واپس کر دیا جاتا ہے یا پھر معذرت کر لی جاتی ہے بلکہ آپ کو یہ اپنی طرف سے ایک موٹا تازہ مشورہ بھی بطور طعنہ سننے کو مل سکتا ہے۔ اگر آپ کسی کو مشورہ دیتے ہیں تو ساتھ 99 حوصلے بھی دینے پڑتے اور تاکید علیحدہ کرنا پڑتی ہے تاکہ وہ مشورے کو کم از کم ایک دفعہ ضرور آزمائے۔ جیسے ایک پتھر سو ویں ضرب سے ٹوٹتا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ پہلی 99 ضربیں بیکار تھیں۔ بہرحال مرزا صاحب نے سیاسی حلقوں میں ہل چل مچا دی ہے اور یہ ہل چل فوری طور پر مسئلے کے ''حل'' یا پھر ''چل'' کا تقاضا کرتی ہے۔

☆.....☆.....☆

''کیچڑ اچھالنا''

کیچڑ اچھالنا اور وہ بھی مون سون میں یقینی طور پر آسان کام ہے بشرطیکہ آپ کے پاس کم از کم موٹر سائیکل رکشا ہو اگر بدقسمتی سے آپ پیدل چل رہے ہوں تو آپ کا دوسروں پر کیچڑ اچھالنے کا شوق دھرے کا دھرا رہ جاتا ہے اور ایسی ''ماہرانہ'' کوشش بھی نہ کیجئے ورنہ آپ بھگی بلی کی طرح نظر آئیں گے کیونکہ کوئی دوسرا یہ کام کر جائے گا۔ ابھی آزاد کشمیر کے نتھے منے الیکشن ہی سامنے آئے ہیں لیکن ایک دوسرے پر آزادی سے کیچڑ اچھالنے کی مشقیں شروع ہو گئی ہیں اور مون سون کی سہولت کی وجہ سے کشمیری پارٹیاں بری طرح ''زیر آب'' آ رہی ہیں۔ ہمارے سٹریٹ سائنسدانوں کو کیچڑ اچھال کر دوسرے کو آگ لگانے کا تجربہ کرنا خوب بھاتا ہے کیونکہ یہ شاید قانون کی خلاف ورزی کے زمرے میں نہیں آتا۔ چونکہ ہر جگہ اور علاقے کا قانون علیحدہ ہوتا ہے اور لوگ ایک علاقے سے دوسرے علاقے میں داخل ہو کر قانون کی خلاف ورزی کر لیتے ہیں جیسے آپ بھوکے کو کھانا کھلائیں یہ بہت اچھی بات ہے لیکن اگر آپ نے چڑیا گھر میں کسی بھوکے جانور کو کچھ کھلایا تو یہ قانون کی خلاف ورزی ہوگی۔ یہ الگ سوال ہے کہ صرف قانون ہی کی کیوں خلاف ورزی ہوتی ہے اور کی گئی حرکت خلاف قانون کیوں ہوتی ہے۔ اگر کسی میں اخلاقی جرأت ہو تو وہ غلط راستہ اختیار کرنے کے بعد الٹے قدموں لوٹ آتا ہے۔ الٹے قدموں واپس آنے کے متعلق بھی بہت واقعات مشہور ہیں بقول وقار مجروح اگر کسی ویران جگہ کوئی اجنبی عورت نظر آئے اور اس کے قدم یعنی پاؤں الٹے ہوں تو بھاگتے ہوئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دینا چاہئے ورنہ وہ آپ کو کچا چبا سکتی ہے۔ کچا چبانے کی کوشش غصے کا ٹاپ گیئر ہوتا ہے اور یہ عمل اس وقت شروع ہوتا ہے جب یہ محسوس ہو کہ ہمارے اہداف کو ہمارے نشانے سے ہٹایا جا رہا ہے ویسے آجکل کچن ویران ہو چکے ہیں کیونکہ بجلی اور گیس ناپید ہے اور ہم ان حالات میں ایک دوسرے کو ویسے ہی کچا ہی چبانے کی کوشش میں رہتے ہیں۔ کچا چبانے سے مراد یہ نہیں کہ انسان غصے میں بھیڑیا بن جاتا ہے اور اپنے منہ کو سوئس اکاؤنٹس سمجھ لیتا ہے۔ انسان اور جانور میں بہت سے امور میں فرق ہوتا ہے انسان جب خوش ہوتا ہے تو اس کے چہرے پر مسکراہٹ

آ جاتی ہے اور جب غمگین ہو تو چہرہ مرجھا جاتا ہے لیکن جانور کی خوشی غمی اس کے چہرے سے محسوس نہیں کی جاسکتی ہاں ایک حالت میں ان کی پہچان ہو جاتی ہے جب وہ کسی وجہ سے غصے میں ہو۔ در یں صورت انسان اور جانور میں فرق مشکل ہو جاتا ہے۔ انسان کسی انسان سے خفا ہو کر ایسی حرکت کے لیے پر تول سکتا ہے لیکن وہ جان بوجھ کر سانپ یا کسی درندے پر خفا نہیں ہوتا۔ کوئی بھی مجرم اس بات کا اقرار نہیں کرتا کہ اس نے یہ جرم جان بوجھ کر کیا ہے لیکن نرم سے نرم قانون بھی شہری کو کھلی آزادی نہیں دیتا اور مجرم اپنی مکمل آزادی کی خاطر خود کو مجرم بنا لیتا ہے۔ اسی طرح اپنی دکانوں اور اڈے پر بیٹھے کئی ملزم اپنی ملاوٹ کی کمائی سے خالص حرام منافع حاصل کر چکے ہیں بلکہ اب یہ بڑھتے بڑھتے حسابی کلیہ کے مطابق ''ا'' (حرام) ہو چکا ہے۔ یقینی طور پر اب یہ خالص حرام بھی نہیں رہا کیونکہ اس میں حرام کا سود بھی شامل ہو چکا ہے۔ ایک حرام کمائی اور دوسرا اس میں سود کا ''اضافہ'' ایسا عجیب اشتراک سن کر انسان ویسے ہی دم بخود رہ جاتا ہے۔ دم بخود ہونا ایک ایسا محاورہ ہے جسے علیحدہ کرنے سے اس کا کوئی سر پیر نہیں رہ جاتا بلکہ یہ دم ہی توڑ جاتا ہے۔ پاکستانی عوام اس وقت ایسے دم بخود کھڑے ہیں جیسے دیگ کو آگ پر دم دیا ہوتا ہے۔ آج کل اس قوم کو کسی ہمدم کے دم دلاسے کی اشد ضرورت ہے تاکہ اس کے دم میں دم آئے اور بغیر کسی تصادم کے اس کے دم مارنے کی توانائیاں دوبارہ بحال ہوں۔

☆.....☆.....☆

اسامہ، اوباما اور ہنگامہ

چوہا شاید ہر پہاڑی علاقے میں موجود ہوتا ہے اگر ذرا محنت کی جائے اور صرف ایک پہاڑ کو کھودا جائے تو کوئی قیمتی چیز ہاتھ لگے نہ لگے کم از کم چوہا ضرور ہاتھ لگ جاتا ہے اس دوران اگر قسمت آپ کی محنت کا ساتھ نہ دے تو آپ کے ہاتھ لگنے کی بجائے اُسے پہلے ہی بلی اچک لیتی ہے پھر اس کی مرضی ہوتی ہے کہ وہ اس سے کھیلے یا پھر اسے کھیل کھیل میں ٹھنڈا کر دے۔ بلی اور چوہے کا یہ کبڑ و سیڈ طوفان نوح سے شروع ہے جو شاید آئندہ ''بلی ین'' سال جاری رہے۔ بھلے بلی کو سارا سال چھیچھڑوں کے خواب آئیں لیکن جب اس کے بھاگ جاگتے ہیں تو چھینکے میں اپنے کام لگا چوہا ہی دراصل اس کی تعبیر ہوتا ہے اور اسے پکڑتے ہی بلی کی بلے بلے ہو جاتی ہے۔ اپنے گھر میں شیر اور چوہے کے لیے تو یہ کسی بلا سے کم نہیں ہوتی۔ بلی شیر کی خالہ ہے لیکن چوہے کے پہاڑے میں کوئی چانس نہیں کہ یہ کس کا انکل ہے یا انکل سام کا کیا لگتا ہے۔ اگر کوئی سیانی بلی چوہے کے گلے میں گھنٹی باندھ دے تو عین وقت پر اسے کھسیانہ ہونا نہیں پڑتا اور آج کل ڈبل سائلنسر والی گھنٹیاں بھی سامنے آ چکی ہیں جن کی آواز کہیں اور سے سنائی دیتی ہے۔ ان دونوں کو قدرتی طور پر رات کے اندھیرے میں ایک دوسرے کا نیٹ ورک نظر آ جاتا ہے بلکہ یہ دونوں سونگھنے میں باصلاحیت ہوتے ہیں اور رات کے اندھیرے میں اپنی دونوں قوتوں کو استعمال کر کے اپنے ٹارگٹ تک پہنچ جاتے ہیں۔ ایک چوہا ہاتھی پر بیٹھا لکڑی کے ایک پل سے گزر رہا تھا کہ پل بوجھ سے ہلنے لگا تو چوہا گویا ہوا دیکھو! یہ تمہارے اور میرے وزن سے ہل رہا ہے۔ اسی طرح ایک جگہ تین چوہے بیٹھے گپیں ہانک رہے تھے ایک کہنے لگا ایک دفعہ میں نے چوہے مار گولیوں کا پورا ڈبہ کھا لیا لیکن میں اب بھی آپ کے درمیان موجود ہوں، دوسرا کہنے لگا میں ایک دفعہ چوہے مار میں بری طرح پھنس گیا پھر بڑی طاقت کا استعمال کر کے میں وہاں سے بازیاب ہوا، تیسرا کہنے لگا تم ذرا ادھر ٹھہرو میں سامنے بلی سے نمٹ کر آتا ہوں۔ اصل میں بلی چوہے کی یہ لڑائی جسے کوئی نہیں روکتا بلکہ تماشبین اس معاملے کو مزید Hot دیکھنا چاہتے ہیں۔ بقول وقار مجروح اگر بلی کو یہ پتا چل جائے کہ پوٹھوہاری زبان میں چوہا کے معنی چشمہ کے ہوتے ہیں تو وہ

چشمے کے منہ سے کبھی دور نہ ہو چاہے اسے قریب کا چشمہ لگا ہو۔ ہمارے ہاں چوری چکاری کی وارداتیں بہت بڑھ چکی ہیں اور چور کو اگر کچھ نہ ملے تو لاشیں بھی نہیں چھوڑتے اس لئے ہوتا یہ ہے کہ شام ہوتے ہی دروازوں پر تالے پڑنے شروع ہو جاتے ہیں اور تالہ بنا ہی کس لئے ہے کیونکہ کہا جاتا ہے چوری کے بعد تالے خریدنا حماقت ہے۔ تالہ کھولنے کے لیے سب سے پہلے پہلو سے باز دکھلتا ہے اور اس کے بعد ہاتھ اور ہاتھ کے بعد انگلیاں، انگلیاں کھل کھلا کر جیب کو کھولتی ہیں وہاں سے کنجی حاصل کر کے تالے کے دوالے ہوا جاتا ہے۔ تالہ کھولنے سے آسان کام کسی راز کا کھولنا ہوتا ہے اور چپکے سے تالہ اور راز کھولنے والے کا انجام بھی اچھا نہیں ہوتا۔ دیہات وغیرہ کے گھروں میں شام ہی سے تالے پڑ جاتے ہیں لیکن آدھی رات کے وقت ایبٹ آباد میں ہونے والا امریکی ہنگامہ کئی ایک سوال پیچھے چھوڑ گیا ہے اور سب سے زیادہ مخمصے میں خود امریکی عوام ہیں۔ وہ یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ جب امریکی آدھی رات کو کمپاؤنڈ میں داخل ہوئے تو ان کے استقبال کے لیے گھر کے دروازے اور تالے کس نے کھولے۔ اسی طرح وہ یہ بھی جاننا چاہتے ہیں کہ اگر واقعی اصلی اسامہ ان ہاتھ لگ گیا تھا تو عجلت میں اس کا ڈی این اے ٹیسٹ کیوں ضروری تھا۔ ابامہ کی یہ بات سو فیصد درست ہے کہ اگر اسامہ کی نعش سمندر میں نہ ڈالی جاتی تو بہت انتشار پھیل سکتا تھا کیونکہ جب امریکی نعش کو دیکھتے تو لازمی طور اصلی اور نقلی کے متعلق چہ مگوئیاں شروع ہو جاتیں۔ کسی کو مارنے کے بعد یہ بیان دینا کہ وہ اب دنیا میں کہیں بھی موجود نہیں بھی شک وشبے سے کم نہیں ہے اور کمپاؤنڈ سے گولیوں کے کتنے خول برآمد ہوئے ہیں یہ معاملہ بھی عجیب ہے۔

☆.....☆.....☆

سیل سیل سیل

اگر کوئی چالاک، سادہ لوح بننے کی اداکاری کرے تو وہ اس میں کافی حد تک کامیاب رہتا ہے اور سادہ آدمی! چالاک بننے کی کوشش میں اپنی سادگی بھی کھو بیٹھتا ہے اس کے برعکس سیلز مین کے لیے اداکاری کے ساتھ ساتھ کئی صلاحیتوں کا مالک ہونا ضروری ہوتا ہے۔ اگر وہ سردیوں میں برف اور گرمیوں میں کمبل بیچنے کی صلاحیت رکھتا ہے تو کامیاب ہے۔ ایک پٹھان پیراشوٹ فروخت کر رہا تھا خریدار نے پوچھا اسے میں ضرور خریدلوں گا لیکن اس کی گارنٹی کیا ہے۔ اس نے کہا کہ بھائی نہ کھلے تو واپس کر دینا۔ ہمارے ہاں کامیاب فلم بنانے کے لیے سٹوڈیو بیچ دیے جاتے ہیں جیسے کہ اب باری سٹوڈیوں کی باری ہے اور ہمارے کھلاڑی اپنا وائڈ بال بھی بیچ دیتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ بیچنے والا ہمیشہ گھاٹے میں رہتا ہے آج نہیں تو کل وہ ضرور کہے گا کہ میں وہ سستا بیچ بیٹھا تھا۔ ویسے بھی اب کوڑیوں کا روپ چونکہ ختم ہو چکا ہے لیکن دو کوڑی کے محتاج اب بھی مل جاتے ہیں۔ جن ملکوں کے پاس تنخواہ دینے کے لیے پیسے نہ ہوں وہ بھی دو کوڑی کے محتاج ہی کہلاتے ہیں۔ ایک کمپنی کی کچھ اشیاء ارزاں قیمت پر فروخت کے لیے پیش ہیں بس سمجھ لیجئے منگل بازار میں اتوار بازار کا ارادہ ہے اشیاء کی تفصیل درج ذیل ہے:

دانت

تازہ نکالے گئے دانت برائے فروخت ہیں ان سے آپ ایک دفعہ مسکرائیں تو قیمت پوری ہو جائے گی اور انہیں دوبارہ نکالنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ ویسے عام طور پر، اگر ہمارے دانت ڈینٹسٹ کے دانت دیکھ کر نکل رہے ہوں تو وہ بھی گھبرا جاتا ہے اور کیڑا بھی کچھ ایسا ہی کرتا ہے کیونکہ یہ دونوں خراب دانتوں کے دشمن ہوتے ہیں لیکن ہمارے برانڈ کے دانت اپنے دشمن کو دیکھ کر جتنا زور سے پسیں ان کی کبھی شکایت ملی ہے اور نہ کھٹے ہونے کی کمپلینٹ۔

دولت

اسے غلطی سے علم یا حسن کی دولت نہ سمجھ بیٹھیں۔ یہ بالکل اصلی ہے اس دولت سے آپ دنیا کی من چاہی کو ایفیکشن حاصل کر سکتے ہیں لیکن ایجوکیشن کی کوئی گارنٹی نہیں۔ علم ہی ایک ایسی

دولت ہے کہ ایک دفعہ اسے اپنے دولت خانے میں لے جائیں پھر یہ کبھی لٹانے سے بھی ختم نہیں ہوتی بلکہ دوسروں کی جیبوں سے کر کر لمبے ہاتھ کھینچے گی اور آپ کا "پرس" پلاس بن جائے گا۔ مایا سے انسان کو ویسے بھی مایوس نہیں ہونا چاہئے۔ ہماری یہ دولت بالکل وائٹ ہے اور صرف ہماری کمپنی اسے فروخت کے لیے دنیا میں پہلی دفعہ پیش کر رہی ہے صاحب دولت بننے کا نادر موقع۔

سیلابی پانی

یہ فصلوں کی آب رسانی کے لیے نہایت موزوں اور زرخیز ہے کیونکہ اس میں مگرمچھ کی شرمندگی کے آنسو بھی شامل ہیں۔ ہماری یہ پراڈکٹ کئی پلوں کے نیچے سے گزرتے ہوئے اپنے ساتھ ہر قسم کی زرخیزی لیکر آئی ہے لہٰذا اس سیلابی پانی کی ایک اضافی خوبی یہ ہے کہ یہ جہاں سے گزرے وہاں کے مکینوں کے قرضے معاف ہو جاتے ہیں اور نقد امداد کی آفر بھی حاصل ہوسکتی ہے۔ یہ پانی اپنے ساتھ ریاست کے کئی ستون بھی بہانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ سیلابی پانی کی زیادہ سے زیادہ خریداری (جو کہ پانی کے مول ہے) پر ایک ایسا ریلا مفت بھی دیا جائے گا جس میں ریل کے کچھ حصے بھی بہہ کر آ چکے ہیں۔ ایسا موقع شاید عشروں بعد آئے لہٰذا اس پانی کو فوری خرید کر کہیں نہ کہیں سٹور کر لیں۔ اس پانی کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ اسے توڑ کر چوری کرنا بھی آسان نہیں۔ سیلابی پانی کی وافر مقدار اپنی پوری "آب و تاب" کے ساتھ فروخت کے لیے پیش ہے۔

☆.....☆.....☆

''سفید'' امداد

جب سے امریکیوں کو پتا چلا ہے کہ دنیا کا ہر چوتھا بچہ مسلمان پیدا ہوتا ہے تو انہوں نے ''بچے تین ہی اچھے'' کا سلوگن متعارف کروا دیا ہے یہ فیصلہ اس لحاظ سے بھی خوش آئند ہے کہ وہاں بچوں سے زیادہ جانوروں کے بچے نظر آتے ہیں اور ان کی بڑھوتری کے لیے ہر جگہ لیکچر کی سہولت بھی موجود ہوتی ہے، اگر یہی حال رہا تو زیادہ بچوں کے خواہش مند والدین کو محکمہ لائیو سٹاک میں رجسٹریشن کروانا پڑے گی اور جب یہ نسل ''جوان'' ہو گی تو معاشرے کے بارے میں ارسطو کی کونیشن بھی سچی ثابت ہو جائے گی اور ڈارون کا نظریہ بھی۔ ویسے بھی یورپ کا آبادی پر اتنا کنٹرول نظر آتا ہے کہ وہاں مما اور پاپا کے علاوہ کوئی ''بچہ'' نظر ہی نہیں آتا اگر کہیں آ بھی جائے تو ایک بچے کے ساتھ دو کتے ضرور ہوتے ہیں تاکہ اوپر دیے گئے سلوگن پر عمل ہو سکے پھر ایسی خبریں اولیور گولڈ سمتھ کے شعروں کی صورت ملتی ہیں

The man recovered of the bite

The dog it was that died.

ہاں! مما اور پاپا کے والدین بھی بڑی تعداد میں نظر آتے ہیں ہمارے ہاں اکثر والدین اپنے بچوں کو لینے سکول وغیرہ جاتے ہیں لیکن یورپ کے کسی ہائی سکول و کالج کی چھٹی کے وقت یوں محسوس ہوتا ہے کہ مما اور پاپا اپنی ''سزا'' سمیت اپنے گھروں کو روانہ ہیں۔ یورپ کے اکثر ممالک کو اپنی آبادی کی کمی کا احساس ہونا شروع ہو گیا ہے کیونکہ ان کی موجودہ آبادی کی گروتھ بھی ''منفی'' میں ہے بلکہ اس کی سرگرمیاں بھی مثبت نہیں ہیں لہٰذا اس آبادی کے دانے دانے میں استادی کا تاثر ملتا ہے۔ عام طور پر گمان کیا جاتا ہے کہ گورے بڑے دیانتدار، وقت کے پابند، بااصول، محنتی اور محبِ وطن ہوتے ہیں، بظاہر یہ بہت مصروف نظر آتے ہیں، محسوس ہوتا ہے کہ ان کے پاس وقت کم ہے دوسری طرف یہ وقت کے پابند بھی نظر آتے ہیں۔ کم از کم وہ پاکستانیوں کو وقت سے پہلے پہنچنے کا عادی ضرور بنا دیتے ہیں لیکن شومئی قسمت وہ اپنے ایک آدھ ٹارگٹ کی وجہ سے کبھی بوائے اور کبھی گرل فرینڈ کے روپ میں اپنی ساری زندگی کو داؤ پر لگا رہے

ہوتے ہیں۔ اسی طرح نشہ کر کے بے کار رہنا بھی انہیں وقت کی اہمیت کا احساس نہیں دلاتا۔ یہ بات بھی بعید از قیاس ہے کہ گورے غلط بیانی نہیں کرتے کیوں کہ ان کے پاس مزید جھوٹ بولنے کا وقت نہیں ہوتا ورنہ انہیں ''سفید'' جھوٹ کے علاوہ اور کیا سوٹ کر سکتا ہے۔ اگر یہ ساری باتیں ٹھیک ہوتیں تو یورپ میں تھانے، محکمہ آڈٹ، پولیس، ٹائم Punch مشینیں اور عدالتیں کیوں قائم ہیں۔ گوروں کے بارے میں یہ بھی مشہور ہے کہ وہ انسانی ہمدردی رکھتے ہیں ایک امریکی عورت کے بقول وہ دل کی بہت کمزور ہے اس نے جب بھی اپنے خاوند کو سیڑھیوں سے گرایا اسے بہت دکھ ہوا۔ ہمارا یہ بھی گمان ہے کہ گورے بہت دولت مند ہوتے ہیں حالانکہ وہ دولت مند سے زیادہ خواہش مند ہوتے ہیں۔ یہ جتنا قانون کا احترام کرتے، دیانت داری کرتے یا ٹیکس ادا کرتے نظر آئیں، سمجھ لیں کہ یہ دولت کے اتنے ہی شوقین ہیں اور فقط جرمانے کے خوف سے ایسا کر رہے ہیں۔ اگر گورا جوتا پالش کر رہا ہو تو اس کو علم ہوتا ہے کہ اس کی ڈبی میں باقی پالش کتنے Penny کی ہے۔ اگر وہ شراب پی رہا ہو تو بھی بوتل کو دیکھتے ہوئے اس کے یہی جذبات ہوتے ہیں چونکہ یہ بڑے اصولی ہوتے ہیں اگر بوتل کھولیں تو اپنی استعداد سے زیادہ پی کر اٹھتے ہیں اور استعداد، استبداد اور امداد ایک دوسرے کے بالکل متضاد چیزیں ہیں۔ کوئی بے چارہ اپنی گرل فرینڈ کو اپنے والد کی وسیع جائیداد کا تعارف کروا بیٹھے تو ایک ہفتے بعد وہ سوتیلی ماں کی صورت اس کے سامنے کھڑی ہوتی ہے اور ہماری شاید بدقسمتی ہے کہ ہم امداد کی توقع ان صاحبان استبداد سے لگائے ہوئے ہیں۔ کیا ''سفید'' امداد کی یہ جھوٹی ''میراتھن'' جیتی جا سکتی ہے۔

☆.....☆.....☆

تفریح

سنا ہے فٹ بال بہت پرانا کھیل ہے یعنی یہ اس دَور کا ہے جب شہر سیالکوٹ کا وجود بھی نہ تھا شاید اسی وجہ سے یہ انسانی کھوپڑیوں سے کھیلا جاتا تھا۔ چنانچہ کھوپڑیوں کی عدم دستیابی کی وجہ سے یہ کھیل روبہ ''زوال'' ہوتا چلا گیا کیونکہ اس وقت انسانوں کی طبعی عمریں طویل ہوا کرتی تھیں اور شاید ''رسد'' کی کمی کے باعث کھوپڑیوں کے ریٹ بڑھ گئے ہوں۔ بعد ازاں اس دور کی تنظیمیں سر جوڑ کر بیٹھی ہوں گی اور کھیل کو ''کھوپڑی'' سے دور رکھنے کا فیصلہ کیا ہوگا۔ فرق یہ ہے کہ اس زمانے میں کھلاڑی کھوپڑیوں سے کھیلتے تھے اب دولت سے کھیلتے ہیں۔ جسم میں کھوپڑی ہی ایک ایسا عضو ہے جو بدلا نہیں جاسکتا ورنہ کہیں نہ کہیں سے جعلی کھوپڑی والے شخص کے متعلق بھی صدائیں بلند ہوتیں۔ آجکل فٹ بال میں تھوڑی تبدیلی یہ ہوئی ہے کہ اب کھوپڑی کی جگہ ''ہیڈ'' نے لے لی ہے یوں کھوپڑی کا استعمال تا حال جاری ہے۔ اچھا ہینڈ لگانے والے کے سر پر تاج کی آب و تاب دیکھی جاتی ہے اور کبھی وہ ٹیم کا ہیڈ بنا بھی نظر آتا ہے۔ پتھر ٹھوکریں کھانے کے بعد گول ہو جاتا ہے لیکن اس کے برعکس فٹبال کو ٹھوکریں مارنے والا ایک دن خود گول ہو کر تجربہ کار کھلاڑی بن جاتا ہے اور پھر اسے کسی کے خلاف گول کرنے میں مشکل پیش نہیں آتی۔ کئی ملک فٹ بال کو پسند کرنے کے باوجود ہاتھ نہیں لگاتے کیونکہ یہ فاؤل ہوتا ہے لیکن میرے خیال میں

Football is the game in which the hand, the head, and the heart of player run together.

دوسرا فرق یہ ہے کہ آج کل یہ کھیل کھوپڑی کی بجائے چمڑے سے کھیلا جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ کھال کا رنگ بھی کاروبار پر اثر انداز ہوتا ہے، اس میں سفید رنگ خاص طور پر قابل ذکر ہے اس لئے فٹ بال کا رنگ کبھی سیاہ نہیں ہوتا ورنہ اس کے پیچھے کون بے وقوف بھاگے گا؟ لہٰذا سیاہ رنگے فٹ بال کو آف سائیڈ قرار دیا جاچکا ہے لیکن اچھی کوالٹی کے فٹ بال ہمیشہ ''بلیک'' ہوتے ہیں۔ فٹبال کی تیاری میں گائے یا بچھڑے کی کھال استعمال ہوتی ہے شاید

اس لئے بھارت اور اسرائیل اپنے بڑے وسائل اور آبادی کے باوجود اس کھیل میں اتنی دلچسپی نہیں لیتے اور انہیں لینا بھی نہیں چاہئے بلکہ احترام کا تقاضا یہ ہے کہ کرکٹ اور ہاکی وغیرہ سے بھی اجتناب کیا جائے کیونکہ ان کا گیند بھی انہی جانوروں کے ''متبرک'' چمڑے سے تیار ہوتا ہے۔ اگر گائے کے علم میں ہوتا کہ اس کے چمڑے سے ورلڈ کپ فائنل کے لیے فٹ بال بنے گا تو شاید وہ بھی اپنی کھال کی حفاظت کے لیے کسی اچھے لوشن کا تقاضا کرتی۔ چمڑے اور جلد کا فرق مدنظر رکھنا بھی ضروری ہے بس فرق یہ ہے کہ جانوروں کا چمڑہ اور انسانوں کی جلد ہوتی ہے اور جلد کی خوبی ہے کہ اس کے اندر انسان یا کتاب ہوتی ہے۔ کئی ظالم بادشاہ کسی عالم کی کھال اتروا کر ان کے اندر کی کتاب پڑھنا چاہتے تھے اور ناکامی اس لئے ہوئی کہ انہیں پڑھنا آتا ہی نہیں تھا۔ فٹبال کی تیاری کے لیے چیتے کی کھال استعمال ہو تو میچ بڑے تیز ہوں گے۔ اسے مزید تیز کرنے کے لیے فٹبال میں ہوا کی جگہ ہائیڈروجن بھرنے کا تجربہ بھی بہتر رزلٹ دے سکتا ہے۔ فٹبال کی تاریخ بتاتی ہے کہ ایک کھلاڑی کی جانب سے لگائی گئی کِک گول میں داخل ہونے کے باوجود گول قرار نہ پا سکی تھی کیونکہ فٹ بال راستے میں پھٹ گیا تھا اور بقول ریفری گول میں داخل ہونیوالے فٹبال کو عالمی معیار کے مطابق، وزن اور سائز میں پورا ہونا چاہئے۔ ریفری کے بارے میں عرض ہے کہ یہ اپنے بچوں کو بھی فائیو یارڈ دور رکھتے ہیں۔ یورپ کی عورتیں بھی اس کھیل میں دلچسپی لیتی ہیں کیونکہ فٹبال مذکر ہونے کے باوجود ٹھوکروں میں ہوتا ہے۔ گول کیپر ٹیم کا اہم رکن ہوتا ہے حالانکہ پورے میچ میں صرف چند سیکنڈ اس کے ہاتھ بال لگ پاتا ہے۔ ایک سردار جی کے بقول اس کی بیوی بھی بہت اچھی گول کیپر ثابت ہو سکتی ہے کہ اس نے ایک ماہ سے مجھے گھر میں گھسنے نہیں دیا۔ سیالکوٹ سے روزانہ ڈیڑھ لاکھ کے قریب فٹبال برآمد کئے جاتے ہیں مگر اس کھیل میں ہم وہ مقام حاصل نہیں کر سکے جو ہمیں اس کاروبار میں حاصل ہے بھلا کیوں آپ نے کبھی مٹھائی والے کو اپنی شادی کے لڈو کھاتے دیکھا ہے؟

☆.....☆.....☆

''چاقو چوبند''

تجربے میں آیا ہے کہ کالج کی زندگی ذرا عجیب اور ہاسٹل کی بڑی غریب ہوا کرتی ہے لیکن اکثر طالب علم اس عجیب وغریب امتزاج سے بھی نباہ کرنے میں بھی کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اگر آپ کا گزر کسی ہاسٹل کی جانب ہو تو یہ ایک پختہ جھونپڑی کی طرح محسوس ہوتا ہے اور زیادہ تر طالب علم بمشکل گزارا کرتے نظر آتے ہیں بھلے وہ اپنا روپیہ اپنے ''زیرِ تعمیر'' مستقبل پر لگا رہے ہوتے ہیں لیکن پھر بھی بڑے مہمان نواز ثابت ہوتے ہیں حالانکہ ان کے ہاں روپیہ کمیاب ہی ہوتا ہے۔ لفظ روپیہ شاید ''روح پیا'' سے نکلا ہے کیونکہ اس کی کمی بیشی محسوس کرنے والا محض ایک بہروپیا بن کر رہ جاتا ہے۔ آج مجھے اپنے ہاسٹل کی کسمپرسی کی یادیں آ رہی ہیں دل چاہا کہ ان کا کچھ ذکر کیا جائے۔ کالج میں داخلے کے پہلے ہی روز دوسرا داخلہ ہاسٹل اور تیسرا کچھ دیر کے لیے ہسپتال میں بھی ہوا۔ تینوں داخلوں نے مجھے اتنا پریشان کیا کہ مجھے وزارت تعلیم وصحت کی اہمیت کا احساس ہو گیا۔ حالات نے ہمیں بی کام کرنے پر مجبور کیا جس کا بعد میں احساس ہوا کہ درحقیقت یہ بگڑا ''کام'' ہے جو سارے کا سارا ''فنگریزی'' میں ہے اور میرے زیادہ تر ساتھی گاؤں دیشی تھے۔ ان دنوں فلموں کے شوقین بھی بہت ہوا کرتے تھے اور فلم انڈسٹری کا اقبال بھی بہت بلند تھا یعنی اس وقت اقبال حسن، اقبال بانو اور اقبال کشمیری وغیرہ زندہ تھے۔ ہاسٹل کا دور ایسا ہوتا ہے جس میں دشمنوں کو تو معاف کر دیا جاتا ہے دوستوں کو نہیں۔ ہمارے ہاسٹل میں انسانوں کی بڑی قسمیں پائی جاتی تھیں جو ایک ''ریوڑ'' کی صورت رہتے تھے۔ ہاسٹل کے عہدیداروں غلام علی اور خادم حسین وغیرہ نے یہاں امن قائم رکھنے کے لیے کچھ مضحکہ خیز اصول بنا رکھے تھے جس کی پہلی شق یہ تھی کہ آپس میں صرف ایک قسم کی گالی دی جائے تاکہ فری سٹائل گالی گلوچ پر قابو رہے اور دن میں صرف ایک گالی کی اجازت تھی اور کھانے میں سالن بھی ایک بار دیا جاتا لیکن ٹی وی روم میں ایک چینل کی پابندی ہر روز ایک دھینگا مشتی کا باعث بنتی تھی۔ دوسری شق انڈور کھیلوں کے متعلق تھی جس کے مطابق صرف فلاش کی اجازت تھی لیکن کئی ''طالب علم'' نظریہ ضرورت کے تحت تاش بھی کھیل لیتے تھے جس کا علاج خادم اور غلام کے

پاس کچھ نہ تھا لیکن وہ اپنے ناموں کی برکت سے کئی معاملات سنبھال لیتے تھے۔ دروازوں پر ہر روز کوئی نہ کوئی نیا جملہ سامنے آتا جو کسی دہشت گردی سے کم نہ ہوتا۔ ایک دروازے کے اوپر M.A.D لکھا ہوا تھا بعد میں پتا چلا کہ یہ مظہر علی درانی کا کمرہ ہے۔ ایک وقت تھا جب یہ اپنے ازار بند کے ساتھ چاقو لگائے ''چاقو چوبند'' نظر آتا تھا۔ اگر ہمارے ہاسٹل میں ٹوٹی بلیئر ہوتا تو شاید وہ بھی کمرے کے باہر ٹی بی ہاؤس لکھنے سے گریز نہ کرتا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک کمرے کے باہر موضع پرانا کوٹ لکھا تھا جسے موزہ پرانا کوٹ کر دیا گیا اور چاک سے لکھے گئے جہلم ہاؤس کو جہنم ہاؤس بنا دیا گیا۔ اسی کمرے میں ایک ندیم رہتا تھا جو ہر کسی کو دوست بنا کر دیمک کی طرح گلے لگ جاتا تھا جس کا نام بعد میں ''ندیمک'' پڑ گیا لیکن وہ جہانگیر سے کتراتا تھا جو بغلگیر ہونے میں اس سے بڑھ کر تھا۔ بیچارے اکرم شیخ سے اکثر یہ سوال ہوتا کہ تم واقعی شیخ ہو یا کسی عادت کی وجہ سے تمہارا نام پڑ گیا ہے۔ ملتان سے تعلق رکھنے والے انور کو انور لٹور اور کبھی اس کے نام کے شروع میں ''ج'' کا اضافہ کر کے اپنا ادبی شوق پورا کر لیا جاتا تھا۔ ان دنوں ٹرپل ٹو کا تو کہیں ذکر نہ تھا لیکن ہمارا ٹرپل ٹی یعنی تنویر تالہ توڑ کسی کمرے کی چابی کے گم ہونے کی صورت میں تالا توڑنے کی خدمات پیش کیا کرتا تھا۔ اگر کسی کمرے کا تالہ ٹوٹا ملتا تو اسے ہی بھگتنا پڑتا اس کے نزدیک کسی کمرے کا دروازہ صرف بند ہوتا لاک نہیں ہوتا۔ اپنے اس ہنر سے وہ کسی بھی وقت کسی بھی کمرے کو اپنا سمجھ لیا کرتا تھا اور ان حرکات کے باعث اسے ہاسٹل کے کمرے میں کئی دفعہ ''لاک اَپ'' بھی کیا گیا۔ بالآخر اس نے اپنے تمام کاموں سے توبہ کی مسجد کا تالہ توڑ کر دو نفل ادا کیے اور ہاسٹل واپس آ گیا۔

☆.....☆.....☆

''چاقو چوبند''۔۲

ہمارے کمرے میں بھی کمال کے لڑکے تھے اور ان میں شرافت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ ان میں ایک اعجاز اور دوسرا شرافت عالم تھا، وہ آپس میں گہرے دوست بن چکے تھے۔ ان دونوں کا یہ اصول تھا کہ کمرے میں داخل ہونے سے پہلے شرافت سے اجازت لیں۔ ہمارے ساتھ چندابٹ کی الاٹمنٹ بھی تھی جس کا مکا بڑا مشہور تھا جو زمانہ امن میں بھی چل جاتا تھا۔ اس کا تکیہ کلام تھا ''میرا نام بدل دینا'' چنانچہ اس کی فرمائش پر ہی اسے درندہ بٹ کہا جانے لگا۔ پرنسپل صاحب نے بٹ کو اس شرط پر ہاسٹل میں داخلہ دیا تھا کہ اسے شرافت کے ساتھ رہنا ہوگا لہٰذا ہوسٹل میں ایک بات بہت مشہور تھی کہ اپنے کمرے میں تو درندہ بٹ بھی شرافت کے ساتھ رہتا ہے۔ بٹ کی دوستی ایک سعد نامی لڑکے کے ساتھ بھی تھی جو ساتھ والے کمرے میں رہتا تھا جسے ایک واقعے کے بعد سعد سے فساد کا شُہرہ بھی حاصل ہوا۔ ایک دن بٹ کی کتاب آگے پیچھے ہوگئی۔ اس نے اعجاز سے پوچھا کہ شرافت سے بتاؤ میری کتاب کس نے اٹھائی ہے۔ دریں اثناء شرافت بھی کمرے میں آ گیا اور اعجاز نے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے کتاب کے بارے پوچھا۔ شرافت نے اس سے کہا کہ میں نے کتاب کا کیا کرنا ہے میں تو ہر کتاب کو آسمانی سمجھ کر ہاتھ نہیں لگاتا۔ بٹ کو شرافت کی زبان سمجھ نہ آ سکی اور اس نے اس کے منہ پر ایک مکا رسید کر دیا۔ بات پرنسپل کے نوٹس میں لائی گئی تو انہوں نے یہ تنبیہ کی کہ ان کے ساتھ شرافت سے بات کی جائے اور اس کے بعد ہم کبھی شرافت کے عالم میں نہ رہ سکے۔

ویسے مجھے تجربہ ہوا کہ ہاسٹل میں شرافت کے ساتھ نہیں رہا جا سکتا اور دوسرا یہ کہ یہاں رہنے کے لیے باورچیوں میں سے ایک مرغا پھانسنا ضروری ہوتا ہے تاکہ وہ آپ کو مرغن ماحول سے باہر نکلنے نہ دے۔ ساتھ والے کمرے میں ایک مرغ پسند قیصر نامی لڑکے کا ہاضمہ اس کا ساتھ نہیں دیتا تھا۔ گھر والوں نے اسے جی لگا کر پڑھنے کے لیے بھیجا تھا مگر اس کا جی کمرہ طعام میں کچھ زیادہ لگنے کی وجہ سے اکثر متلاتا رہتا۔ اسے بٹ نے شرافت کے ساتھ سمجھایا کہ قیصر تم اپنا نام بدل لو یا طعام! کیونکہ تمہارے نام کے آغاز ہی میں ''قے'' لگا ہوا ہے۔ اسی کمرے میں

ایک تیز چھری ہوا کرتی تھی اس کی تیزی کی وجہ یہ تھی کہ اس سے جھاڑو کا کام لیا جاتا تھا۔ کمرہ نمبر گیارہ والوں پر مجھے اس وقت بڑا ترس آتا تھا جب میرے خیال کے مطابق اس کمرے میں بارہ لوگ رہتے تھے۔ کمرے کے باہر ان کے نام ایسے لکھے ہوتے۔ مظہر اسلام شاہد، تنویر قیصر زاہد، طارق جمیل ناصر، اظہر سعید انور، بعد میں پتا چلا کہ لڑکے چار ہی ہیں لیکن ان کے نام پاسپورٹ سائز ہیں۔

کوئی مہمان نواز کسی کی خاطر شاطر کرتے ہوئے اسے اسی ہاسٹل کی کینٹین میں چائے پیش کرتا۔ اس کینٹین کا حفظان صحت کا معیار اتنا اچھا تھا کہ کبھی کسی مکھی نے بھی شکایت نہیں کی۔ یہاں ایک ننھا نامی بچہ کام کیا کرتا تھا اب شاید اس نے بھی کہیں اپنی ننھی سی کینٹین کھول کر چائلڈ لیبر رکھ لی ہو، جب وہ اپنے دونوں ہاتھوں سے چائے کے کپ لئے کینٹین میں بگولے کی طرح گھومتا لیکن وہ چائے بھی گرنے نہیں دیتا۔ جب ہم لوگ ہاسٹل سے فارغ ہوتے ہوئے اس سے معافی کے طلب گار ہوئے تو اس نے ہم لوگوں سے بھی معافی مانگی کہ وہ ہمیں کپوں میں بچی کھچی چائے سپلائی کر کے ٹرخایا کرتا تھا۔ جیسے فادر ڈے پر باپ نے بچوں سے اپنی گزشتہ مار پیٹ پر معذرت کرتے ہوئے کہا کہ اسے افسوس ہے کہ وہ غصے میں ایسا کرتا رہا۔ بچوں نے بھی اپنے والد سے معافی مانگی کہ وہ بھی اس کے ٹوتھ برش سے واش روم صاف کرتے رہے۔ ہاسٹل سے فارغ ہونے تک ہمیں بہادری اور بے وقوفی کا فرق معلوم نہ ہو سکا بعد میں پتا چلا کہ اس میں صرف Cause کا فرق ہوتا ہے۔

☆.....☆.....☆

بندر، برگد اور بچن

شہزادہ چارلس اور ڈیانا کی شادی کے بعد ایک اور شادی کے بھی چرچے ہیں حالانکہ وہ کسی چرچ میں منعقد نہیں کی گئی۔ یہ شادی برٹنی پیرز کی بھی نہیں جسے سہاگ رات کو ہی طلاق کا فراق پہنا دیا گیا۔ بلاشبہ یہ شادی ایشوریہ رائے اور ابھیشک بچن کی ہی ہو سکتی ہے۔ پنڈت ''ابھی شک'' میں مبتلا ہیں کہ یہ شادی کامیاب بھی رہے گی یا نہیں۔ بھلا ان سے کوئی پوچھے کامیاب شادی صرف اسے کہتے ہیں جو علیحدگی کا باعث نہ بنے۔ شادی سے قبل پنڈتوں کو ایشوریہ رائے کی جنم پتری سے کچھ اشارے ملے تھے کہ اس کی صرف تیسری شادی کامیاب رہے گی۔ شادی ڈبی کا کوئی آخری سگریٹ تو ہے نہیں جسے پہلے پی لیا جائے لہٰذا پنڈتوں نے ایشوریہ کو یہ ''مشورہ'' دیا تھا کہ وہ ستاروں کی نحوست زائل کرنے کی خاطر پہلے دو عدد ''ڈمی'' شادیاں کرے اور کرے بھی بندر اور برگد کے درخت سے، کیونکہ ہندو مذہب میں یہ بڑے ''اکسیر'' گنے جاتے ہیں۔ یہاں پر جوتشیوں نے نحوست زدہ ستاروں کا نام نہیں لیا جو کہ یقیناً فلمی ستارے ہی ہو سکتے ہیں۔ ہمارے نوجوان نے بھی علامہ اقبال کے شعر کا غلط مطلب لے کر ہی فلمی ستاروں کو کمند ڈالنے کا قصد کیا ہوا ہے۔ قبل ازیں جوتشیوں نے یہ پابندی بھی لگا دی تھی کہ درخت ایسا ہونا چاہئے کہ جس پر کبھی بندر نہ چڑھا ہو اور بندر بھی ایسا ہونا چاہئے جو کبھی اس درخت پر نہ چڑھا ہو۔ کئی بے چاروں نے اس شگون پر بڑی سوچ بچار کی بعد ازاں کسی بے چارے نے بچن بھیا کی مشکل یوں حل کی کہ دونوں ''دولہے'' چڑیا گھر سے مل جائیں گے اور الو بھی سیدھا ہو جائے گا۔'' کہا جاتا ہے کہ ہر فنکار خاص قسم کا انسان نہیں ہوتا لیکن ہر انسان خاص قسم کا فنکار ضرور ہوتا ہے۔ اسی طرح ہر شخص کا ایک ماضی ہوتا ہے اور اداکارہ کے کئی ہوتے ہیں۔ بات یہاں سے بڑھی جب بنکاک میں شوٹنگ سے واپسی پر ایشوریہ نے اپنے والد سے کہا کہ ابھیشک بچن بڑا اچھا انسان ہے اس نے بنکاک میں میرا بڑا خیال رکھا اور چوبیس گھنٹے میری خدمت کا بیڑا اٹھائے رکھا لہٰذا معمولی ریہرسل کے بعد ہم نے شادی کا حتمی سین فلم بند کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے کیونکہ اس سے قبل رانی مکرجی اپنے قول وقرار سے ''مکر'' چکی تھی اور اب نیا خطرہ مول لئے بغیر

نئی شادیوں کی طرف الٹا سفر شروع ہوتا تھا یعنی دولہن نے پہلی اور دوسری شادی کے لیے چڑیا گھر کا رخ کرنا تھا جہاں ایک دولہا سیدھا اور دوسرا الٹا لٹکا ہوا تھا۔ جیسے! دلہن اپنی برات لیکر چڑیا گھر پہنچی جہاں برگد پہلے ہی اپنی آخری آرام گاہ پر لہلہا رہا تھا چنانچہ اس نے برگد کے درخت پر ہار ڈالے اور گھنڑی کی جگہ پانی گھڑی پیش کی۔ اس سہاگن کو آگ میں سہاگہ ڈال کر پھیرے ڈالے گئے اور درخت کو دیا گیا صرف ''پھیرا''

چنانچہ اس درخت کے سائے ہی میں، نحوست کے سائے ختم کرنے کی کوشش کی گئی۔ یہاں یہ کہاوتیں بھی سچ ثابت ہوئیں کہ ''پیا سا کنوئیں کے پاس آتا ہے'' اور ''پیت نہ جانے جات کجات'' یہ پہلی خوش قسمت زنانہ بارات تھی جو نکاح کے ساتھ طلاق کا کوپن لیکر واپس ہوئی۔ اگلے دن یہ بارات نئے چہروں کے ساتھ، خفیہ طور پر دوبارہ چڑیا گھر روانہ ہوئی جہاں پر بندر اپنے بندھن کے لیے گلے میں موتیوں کی مالا ڈالے بور کے لڈو کھانے کے فن کا مظاہرہ کرنے کے لیے تیار بیٹھا تھا۔ یہاں کئی دوسرے جانور اسے سمجھا رہے تھے کہ

''ہنومان،

ہمری مان،

بن انسان''

کہیں یہ حسن کی دیوی تمہارے ساتھ کوئی چال ہی نہ چل دے۔ اپنے ''پتی'' ہنومان کے سامنے آتے ہی ایشوریہ نے ہاتھ جوڑ کر اسے ناسمتے کیا۔ اس سے قبل ایشوریہ نے جوئیں نکالنے کی مشق اس غرض سے کی تھی کہ کہیں ''وہ'' بعد میں اس کے کام سے کیڑے نہ نکالے۔ یہ مشورے ایشوریہ کی ماتا جی نے دیئے تھے کہ ایسے ہی ''بہادری'' کے ساتھ ''جیا'' جاتا ہے کیونکہ اس کی ساس کا حقیقی سین جیا بہادری نے کرنا تھا جسے تمام رول کرنا آتے ہیں۔ بندر نے اشاروں کنایوں میں ایشوریہ کو پیغام دے ڈالا تھا کہ ہماری شادی کامیاب رہنا چاہئے کیونکہ میں ایک بے عیب باشندہ ہوں میں نے کبھی کسی سے عیب تک نہیں نکالا سوائے کسی ضرورت مند بندریا کی جوؤں کے..... یہ جوئیں ویسے بھی میری کمزوری ہیں جو میری کمزوری وکم ظرفی کو دور کرتی ہیں۔ یہ جوڑا ایک دوسرے کو خوب نچاتا اگر یہ بندھن کسی طرح پروان چڑھتا لیکن ایشوریہ کی نظر اگلے ''مچھندر'' پر تھی جو ڈارون کی تھیوری کے مطابق انسان کا روپ دھار چکا تھا لیکن اس سے قبل بندر کو بیاہ کے بعد ''بے آہ'' چھوڑنا تھا۔ یہاں پر بھیروں کے دوران ایتابھ بچن کی پریشانی دیدنی تھی جو ہنومان کی ناراضگی بھی مول نہیں لینا چاہ رہا تھا۔ اعھیشک بھی شک

میں مبتلا تھا کہ ایشوریہ اب ڈوبے پیک نہیں رہی۔ ایشوریہ کا ہونے والا سسر اس وقت تک اس کی ''راکھی'' کرتا رہا جب تک بندر نے ایشوریہ کو راکھی نہ باندھ دی۔ بہرحال ایک کٹھن مرحلے سے گزر کر دوسری نحوست کا خاتمہ ہوا اور بالآخر بندر اپنی دم سادھے رہ گیا۔ ایک پڑھے لکھے فنکاروں کی ضعیف العتقادی کا یہ حال ہے ہماری فنکاراؤں کا کیا حال ہوگا جو سکول میں کبھی تعلیم تو کیا تصویر لینے نہیں گئیں۔ ان کی علمی قابلیت کا اندازہ تو سب کو ہے لیکن ان میں سے کچھ کو بیرون ملک سے ''آلہ تعلیم'' بھی حاصل ہے۔ بچن اینڈ کو ایک پڑھا لکھا فنکار خاندان ہونے کے باوجود کمزور فلکر ثابت ہوا ہے۔ ویسے فنکارائیں ہر ملک کی ایک جیسی ہوتی ہیں چاہے وہ جتنی بھی پڑھی لکھی کیوں نہ ہوں۔ اگر بغور دیکھا جائے تو شادی ایک ایسی فلم ہے جس کے پہلے سین میں ہیروکٹ جاتا ہے۔ شادی شدہ جوڑے میں ایک قدر ضرور مشترک ہوتی ہے کہ ان کا شادی کا دن ایک ہی ہوتا ہے۔ فلمی ٹریجڈی یہ ہوتی ہے کہ جس میں ہیرو کی کوششیں ناکام ہوتی دکھائی دیں اور اگر فلم ہی فلاپ ہو جائے تو یہ فلمساز کے لیے بڑی ٹریجڈی ہوتی ہے۔ ایک اداکار، اداکارہ سے شادی کے بعد اپنے آپ کو ''وہ'' محسوس کرتا ہے یعنی پتی، پتنی اور ''وہ'' آج کل بچوں کی ایشوریہ رائے کے بارے میں کیا رائے ہے یہ کہانی ابھی سسپنس میں ہے یہ بھی مشکل ہو گیا ہے کہ کوئی امیشک سے کہے کہ ذرا مجھے اپنی فلم کے لیے ''رائے'' دیجئے۔

☆.....☆.....☆

''Shoe جات''

اگر مربہ جات اور حلوہ جات جیسے تحفہ جات ہو سکتے ہیں تو ''Shoe جات'' کے معنی خیز گفٹ کو قبول کرنے میں بھی ''کوئی ایسی بات نہیں'' آسکر وائلڈ کہتا ہے کہ سادگی کیا ہے؟ سادگی یہ ہے کہ کسی شخص کو ہر چیز کی قیمت معلوم ہو اور قدر کا اندازہ نہ ہو۔ ہمارے ایک چوہدری صاحب کا نام ذہن میں آتے ہی سادگی اور سیاسی شگفتگی کا احساس بڑھنے لگتا ہے اور چہرے پر ''علاقائی'' مسکراہٹ کھلنے لگتی ہے۔ وطن عزیز میں انہیں سیاسی مقام کے ساتھ ساتھ وہ خاص حمام بھی حاصل ہے جس میں نہانے کے بعد نچوڑنے کی کوئی قید نہیں۔ سیاسی حمام کے استعمال کے باعث ان کے جملے اور حتیٰ کہ لب ولہجہ بھی ڈیلوینک ہو چکا ہے۔ اگر آئین کی کوئی غیر مبہم شق سامنے آئے تو سمجھ لیں اس کی اتنی آسانی سے تشریح نہ ہو سکے گی کیونکہ یہ موصوف کے پھڑپھڑاتے لہجے میں شامل ہی کی گئی ہے۔ جیسا کہ آئین میں یہ شق انگریزی میں لکھی گئی ہے کہ پاکستان کی قومی زبان اردو ہوگی۔

موصوف نے فن سیاست میں مضافاتی سیاست کو استادی گھرانے کے طور پر اختیار کیا ہوا ہے اسی وجہ سے مشکل سے مشکل سیاسی سوال اپنے جٹ بوٹ جملوں سے حل کر لیتے ہیں۔ یہ بوٹوں کی آواز کے ویسے بھی بہت شوقین ہیں اور اس آواز کو ''دور'' ہی سے سن لیتے ہیں اور اس بوٹوں بھری موسیقی کی محفل میں بوٹوں سمیت گھس جاتے ہیں اور وہاں گانے کی پہلی فرمائش ایسے کرتے ہیں ''بئی ذرا مجھے نصیبو کا گانا، بوٹوں کی آواز میں سناؤ''..... پھر، بھلے یہ راگ بوٹ بھیروی گیارہ سال تک چلتا رہے اسے ''خیال'' سے سنتے ہیں کیونکہ یہ خود اس قسم کا راگ گا نہیں سکتے لیکن بغلیں بجا کر اس کورس میں شامل ہو جاتے ہیں اور خوب داد شجاعت پاتے ہیں۔ اسی دوران ان کے کئی ساتھی بوٹ بغل میں دبائے بھاگ چکے ہوتے ہیں جس طرح نزدیک کی عینک ہوا کرتی ہے اسی طرح انہوں نے دور کا ایک آلہ سماعت برائے حالات بھی بنوا رکھا ہے جس سے بسا اوقات اپنے کان خود ہی بھر لیتے ہیں۔ ان کے بقول اپنے کسی مسئلے پر کان دھرنا ضروری ہوتا ہے نہ کہ ''دھرنا'' بس ایسے آلات و بیانات سے اپنے مخالفین کے کان کترتے

رہتے ہیں۔ بڑے وسیع القلب واقع ہوئے ہیں اور چھوٹی موٹی باتوں، ذاتوں اور کھاتوں کا نوٹس نہیں لیتے، حتیٰ کہ مشرقی پاکستان کے سانحے پر کہنے لگے "کوئی ایسی بات نہیں"

یہ جملہ بارہ اکتوبر، آٹھ اکتوبر کے زلزلے، تین نومبر اور اپنے حلقے سے ہارنے کے بعد بھی ادا فرما چکے ہیں، یعنی ہر جملے کے ردیف کے طور پر یہی گرہ لگاتے ہیں۔ یہ ان کمزور فکر سیاسی لوگوں میں سے نہیں جو اپنے سیاسی مخالف کے گھر پیدا ہونے والے تین جڑواں بچوں کے خلاف دوبارہ گنتی کی درخواست دے دیں۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ شاید ان کی نظر کمزور ہو چکی ہے اس بارے میں عرض ہے کہ جو پرندہ کسی کے سامنے پر نہیں مار سکتا یہ اس کے بھی پر گن لیتے ہیں اور لیڈر کی یہی خوبی ہوتی ہے جب جارج بش پر جوتا پھینکا گیا تو اس نے فوراً کہا تھا کہ یہ دس نمبری ہے حالانکہ اس نے ہوا میں اس کا صرف ٹین پرسنٹ نظارہ ہی کیا تھا۔

☆.....☆.....☆

''Shoe جات''

ویسے سیاست بڑی تگ و دو کا نام ہے۔ چھوٹے سے چھوٹا کام بھی زندگی اور موت کا مسئلہ بنا کر کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ کسی ووٹر کی رحلت چوہدری صاحب کے لیے پیام شوق لے کر آتی ہے کیونکہ وہ افسوس پر جانے کے لیے بصد خوشی تیار ہو جاتے ہیں اور روانگی سے پہلے اپنے ڈرائیور جمال سے احتیاطاً یہ بھی پوچھ لیتے ہیں کہ ''کوئی گلاب جامن وغیرہ کی ضرورت تو نہیں؟'' جمال کی کیا مجال کہ ان کی بات کو ٹالے، لہٰذا وہ گلاب اور جامن علیحدہ علیحدہ پیک کروا لیتا ہے کیونکہ وہ بھی سیاست کی ابجد سمجھنے لگا ہے۔ چوہدری صاحب ابھی کچھ دن پہلے اپنے ایک ہاری کی بھینس کے مرنے کا افسوس کرنے اس کے ہاں گئے، وہاں اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہنے لگے کہ باقی چاروں بھی مر جائیں تو ''کوئی ایسی گل نئیں آج کل ڈبے کا دودھ مل جاتا ہے'' جب یہ افسوس کر کے وہاں سے اٹھے تو یہ ایک قابل رحم منظر تھا وہاں موجود لوگ انہیں طرح طرح کے مشورے دے رہے تھے کہ چوہدری صاحب اپنے گھٹنوں پر ''مالش'' کیا کریں، کسی نے کہا ایک گلاس دودھ پیا کریں اور ایک بزرگ نے بادام کھانے کا مشورہ بھی دیدیا۔ فوراً ان سے مخاطب ہو کر فرمانے لگے کہ مجھے معلوم ہے میرے حلقے والے مجھ پر مال اور دام والے فقرے بہت کستے ہیں کیا میں دودھ پیتا بچہ ہوں۔

ان کی صحت سے لگتا ہے کہ کھانا اندر نہیں کرتے، بس پان کی طرح منہ میں رکھ کر پھینک دیتے ہیں۔ صرف کیک رس شوق سے ''نوش'' فرماتے ہیں اور وہ بھی چائے میں ڈبو کر! اس طرح کیک کا رس بھی خوب نکل آتا ہے۔ اسمبلی کے کیفے ٹیریا سے لئے گئے کیک رس خستہ ہوں یا خستہ حال، دونوں پسند کرتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اس عمر میں بھی اپنے کھانے کا خاص خیال رکھتے ہیں حالانکہ ان کا باورچی انہیں تسلی دے رہا ہوتا ہے کہ آپ کے لیے رکھا گیا کھانا کوئی نہیں کھائے گا لیکن پھر بھی اس معاملے پر مٹی پاؤ والا فارمولا نہیں چلنے دیتے اور بغیر کسی پر بھروسہ کئے جاسوسی رکھتے ہیں۔ اس کام کے لیے آپ نے ایک گہری عینک خرید رکھی ہے جو رات کو دوڑ دھوپ کی خاطر پہنتے ہیں۔ سیاسی بدپرہیزی سے بچنے کے لیے ڈاکٹر انوار کو ہر وقت ساتھ رکھتے

ہیں حالانکہ اس وجہ سے سیاسی ''انوارمنٹ'' کے خراب ہونے کا زیادہ احتمال ہوتا ہے۔

الیکشن ان کی کمزوری ہیں اس لئے ہر الیکشن میں انہیں کسی نہ کسی کمزوری نے ضرور آلیا۔ 1970ء کے الیکشن میں پہلی دفعہ ان کی نظر کمزور ہوئی۔ دریں اثناء یہ آنکھوں کے ہسپتال سے آنکھیں چرا کر بھاگے لیکن پھر بھی نظر بندی سے بچ گئے۔ 1985ء میں ان کا معدہ پہلی دفعہ کمزور ہوا اور اب وہاں کوئی چیز نہیں ٹھہرتی۔ 1988ء میں پھیپھڑے اور 1992ء میں ٹانگیں کمزور ہونا شروع ہوئیں کیونکہ ٹانگیں اڑانے کا ہاؤس جاب نہ کر سکے تھے۔ 96ء میں کانوں نے کام چوری شروع کی تو کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی اور اب ان کے باقی جسم نے اپنا ایک علیحدہ بنگلہ دیش بنا رکھا ہے اور انہیں بالکل کمزورستان بنا دیا ہے۔ اپنی اس داستان سے نتیجہ اخذ کرتے ہوئے نوجوانوں کو یہ مشورہ دیتے ہیں کہ اپنی جوانی ہی میں خود پر لیمینیشن Lamination کروالیں ورنہ.....

ہمارے عوام ان کے جائزوں اور جملوں سے بہت لطف اندوز ہوتے ہیں۔ انہوں نے اپنے علاقے میں بہت سے بائی پاس بنوائے لیکن اپنا نہیں کروایا یہی ان کا سیاسی مشن ہے۔ اپنی سیاسی بصیرت اور شگفتہ بیانی سے بات کو پھیلنے سے پہلے ٹھنڈا کر دیتے ہیں۔ اس لئے ستمبر ہی سے سرد موسم کی تیاری شروع کر دیتے ہیں حتیٰ کہ دفتر کے باہر پارٹی کا جھنڈا بھی اونی لگوا دیتے ہیں۔ دل کے بہت نرم ہیں اپنے بھرتی کئے ہوئے ڈاکیے کو کہہ رہے ہوتے ہیں تم اتنی گرمی میں کیوں آئے ڈاک پوسٹ کر دیتے۔ ایک دن اس کو کہہ رہے تھے کہ محکمہ ڈاک کو جدید ''خطوط'' پر استوار کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ آج کل مجھے کسی پرانے کلاس فیلو کا خط نہیں ملتا۔ جمہوریت کو کچھ اس لیے بھی پسند کرتے ہیں کیونکہ اس میں عمرے ادا کرنے کا کافی موقع ملتا ہے۔ آنے والے وقت میں دیکھئے کیا کرتے ہیں، صلح، عمرہ یا انتظار۔

☆.....☆.....☆

بزدل شاہ دلیروی

شاید جنرل ڈائر کی قبر پر حاضری کے بعد، پرویز مشرف صاحب نے یہ آفر دی ہے کہ اگر عوام چاہیں تو وہ اقتدار حاصل کرنے کے لیے تیار ہیں لیکن انہوں نے یہ واضح نہیں کیا کہ اب وہ اقتدار کے لیے کوسی ایئر لائن یا ایئر پاکٹ کا استعمال کریں گے یا انہیں اقتدار کے لیے اب کون دھکا دے گا کیونکہ اگر کسی نے سیاست میں قدم رکھنے کے لیے انہیں برطانیہ سے دھکا دیا تو اس کا زور زیادہ سے زیادہ مشرق وسطیٰ تک ٹوٹ جائے گا۔ صاحب موصوف ماضی کی آمریت سے نفرت کرتے اور ہر آمرانہ فعل کی نفی کرتے رہے۔ پچھلے تجربوں کے باعث، اپنے آٹھ سالہ دور میں، وردی تو درکنار احتیاط کا دامن بھی ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ ضیاء مرحوم کے حادثے کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اپنی وردی والی پیٹی کو پہلے دور ہی سے چُھوتے پھر کہیں حوصلہ کر کے پہنتے۔ کچھ اسی وجہ سے، آم کی پیٹی تو درکنار، کبھی لنگڑے آم کی آسیم کو ہاتھ تک نہیں لگایا بلکہ اس پھل سے تیار ہر خاص و "آم" چیز سے اجتناب ہی کیا۔ بلکہ یوں سمجھ لیجئے کہ انہیں خوف و ہراس کی "ضیاء بیٹس" ہو چکی تھی اور اپنے پورے دور میں ان کی یہ کوشش رہی کہ ان کا جہاز اندر اور باہر سے بلٹ پروف ہو۔ اپنے دور میں ٹورازم کو ختم کر کے وزارت ٹیررازم کے قیام کے لیے کوششیں بھی کرتے رہے۔ ان کی یہ کوشش بھی رہی کہ یکم مئی کو منایا جانے والا دن یکم اپریل کو ہی منا لیا جائے تاکہ مزدوروں کو کسی قسم کی غلط فہمی نہ رہے۔ ہمارے بلوچی بھائی سمجھتے ہیں کہ شاید پرویز مشرف ہمارا پنجابی بھائی ہے۔ ان کو کیا معلوم کہ وہ پنجابی زبان میں شیر افگن نیازی یا چودھری شجاعت بھی نہیں کہہ سکتے تھے جبکہ بوقت ضرورت انہیں پنجابی میں "چودھری امیر حسین!" کہنے کے لیے آواز کو "ڈب" کروانا پڑتا تھا۔ فقط، پنجابی کا یہ جملہ "پانی پلاؤ" کا صحیح تلفظ بولنا بھی ان کے مشکل ہوتا۔ موصوف اب بھی پانی اور پلاؤ کو پنجابیوں کی علیحدہ علیحدہ ڈشیں سمجھتے ہیں۔ اپنی خوراک کے بارے میں کہتے ہیں کہ میں اس سلسلے میں بھی قدامت پسند نہیں ہوں بلکہ اس الزام سے بچنے کے لیے میں نے کبھی ساگ روٹی نہیں کھائی۔ اب یہ جیسا دیس ویسا بھیس کے فارمولے پر عمل کر کے پیزا کھانے کے شوقین ہو چکے ہیں۔ کسی نے پوچھا کہ آپ کے پیزا کے

آٹھ ٹکڑے کر دیے جائیں؟ یہ اس سے سوالیہ انداز میں پوچھنے لگے کیا میں پیٹو ہوں؟ بس چار ٹکڑے کرو! پرویز مشرف نے اپنے دور میں جمہوریت کے فروغ کے لیے بہت کام کیا بلکہ جانے سے پہلے اس ملک کو جمہوریت کی مضبوط ''چھاؤنی'' بنا گئے۔ ان کی پوری کوشش تھی کہ جمہوریت پروان چڑھے البتہ ان کے کئی غیر جمہوری دوست E.C.L میں ہونے کے باوجود پرواز چڑھ گئے۔ جھوٹ غلطی ہی سے ان کے منہ سے نکلتا ہے یعنی انہوں نے آج تک کبھی لفظ جھوٹ غلط نہیں بولا۔ ان کے استاد نے ان کو بچپن میں یہ سکھا پڑھا دیا تھا کہ جھوٹ لکھتے یا بولتے ہوئے کبھی گرائمر کی غلطی نہ کرنا باقی اپنا معافی الضمیر جیسا چاہو بیان کرنا۔ ویسے جھوٹ کی تین قسمیں منظر عام پر آ چکی ہیں قائل کرنے والا، مائل کرنے والا اور مسائل پیدا کرنے والا۔ آج تک یہ بات ویسے بھی نہیں سنی گئی کہ جھوٹ بول کر کسی کا فائدہ ہوتا ہے اگر ہوتا ہے تو صرف اس کا جس کے ساتھ یہ بولا جا رہا ہو۔

کہا جاتا ہے Never show your teeth if you can't bite. اس میں شک نہیں کہ یہ بڑے بہادر انسان واقع ہوئے ہیں بلکہ ان کا پورا وجود ہی دل گردے سے بھرپور محسوس ہوتا ہے لیکن ہمارے کئی بزدل شاہ دلیروی قسم کے سیاستدان جو بڑی دیدہ دلیری سے ان کے ساتھ ہو لئے تھے اب ''بزدلیری'' سے پیچھے ہٹ گئے ہیں۔ ان کے پورے جسم میں صرف ہاتھ ہی ہینڈسم ہیں جن سے کوئی من پسند چیز ''سم اَپ'' کرنے کا موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے، ایک انگلی میں سونے کی انگوٹھی پہنے رکھتے ہیں۔ انہیں شادی کے لیے بہت ہاتھ پاؤں مارنا پڑے کسی نے پوچھا شادی کی انگوٹھی غلط انگلی میں کیوں پہنتے ہیں کہنے لگے شادی کون سی صحیح عمر میں ہوئی تھی۔ ان کا یہ بھی استدلال ہے کہ انگوٹھی کی صحیح جگہ انگوٹھا ہے جس کی وجہ سے اسے انگوٹھی کہتے ہیں۔ انگوٹھے کو نکال کر، ان کے ہاتھ میں ایک مزید اہم مقام اور بھی ہے اس لئے یہ پاکستان کے چپے چپے سے محبت کرتے ہیں۔ ان کی ہمیشہ کوشش رہی ہے کہ ہر چھوٹے بڑے شہر میں ان کا چھوٹا موٹا چپے بھر کا رہائشی پلاٹ ضرور ہو۔ ویسے ان جیسے بڑے آدمی کو ایک ایکڑ رقبہ بھی چپہ بھر ہی لگتا ہے۔ یوں بھی ایسے بڑے آدمی کو اپنی کاریں پارک کرنے کے لیے بھی ایک سرسبز پارک کی ضرورت ہوتی ہے۔ انہوں نے اپنے دور میں کچھ اچھے کام بھی کئے ہوں گے لیکن تمام کے تمام آب زم زم الٹے ہاتھ سے پینے کے مترادف ثابت ہوئے۔

☆.....☆.....☆

بزدل شاہ دلیروی ۱۱

لوگ آنکھیں یا کان دکھنے پر ڈاکٹر کے پاس جانے کا قصد کرتے ہیں لیکن یہ دل دکھنے پر ڈاکٹر شیر افگن نیازی سے رجوع کرتے جو پہلے ہی قوم کی دل شکنی کے ماہر ہیں اور وہ مریض کا جملہ سنے بغیر ہی علاج تجویز کر دیتے ہیں اگر کوئی ان سے کہے کہ ڈاکٹر صاحب میرا دل ٹوٹ چکا ہے تو اسے کہتے ہیں ہسپتال جا کر اس پر کوئی پلاسٹر وغیرہ چڑھوالو۔ بچپن ہی سے ان کی فنکارانہ صلاحیتوں میں ایک خوبی تھی کہ یہ ان دکانداروں سے بھی ادھار کر آتے جو خود آئی ایم ایف کے مقروض ہوتے۔ اگر ہمارا حکمران ایسا آ گیا جس کا نام ہی امداد ہو پھر ہمیں اس کا نام لیتے ہوئے پریشانی ہوگی اور نہ کسی سے امداد لیتے ہوئے۔ ہر مشکل گھڑی میں کابینہ اس سے گزارش کرے گی کہ امداد صاحب اب آپ یورپ جا کر اپنے فن کا عملی مظاہرہ کر آئیں۔ حکمران کی شخصیت ایک سیاسی جادوگر کی سی ہوتی ہے تاکہ یہ سیاسی حلقوں میں جدوجہد کے ساتھ ''جادو جہد'' بھی جاری رہے۔ سابق صدر نے کئی اہم واقعات اپنی کتاب ''سب سے پہلے پاکستان، اِن دی لائن آف فائر'' میں شامل نہیں کیے لیکن ان کا ذکر کسی نہ کسی جگہ کر کے پھلجھڑیاں چھوڑتے رہتے ہیں۔ ان کی کتاب میں کئی صفحات ایسے ہیں کہ اگر وہ کبھی طالبان کے ہاتھ لگ گئے تو شاید وہ ان صفحات کو ہی سنگسار کر دیں۔ اپنی کتاب میں انہوں نے کسی جگہ یہ ذکر نہیں کیا کہ وہ اپنے زمانے کے بڑے گوہر شناس رہے ہیں مگر ہر وقت کوئی نہ کوئی ''گوہر'' اپنی جیب میں ضرور رکھتے رہے ہیں اور وقت پڑنے پر اسے موم بھی کر لیتے تھے۔ اگر کسی کے نام کے ساتھ گوہر آ جائے تو کیا کہنے، پھر سمجھ لیں کہ یہ اس خالی گدڑی میں سے بھی کوئی نہ کوئی لعل و گوہر نکال لیتے تھے۔ سیاست ویسے بھی حکمرانی کے لئے کی جاتی ہے اور حکمرانی کے لئے رانی کی ضرورت پڑنا پرانی روایت ہے۔ رانی کو حکمران کی کامرانی ہی مہارانی بناتی ہے۔ آپ کو حیرانی ہوگی کہ نوکرانی میں پوری رانی چھپی ہوتی ہے، اس فلسفے سے تو ہمارے درانی صاحب بھی شاید انکار نہ کریں۔ شاید زمانے کے پیچ و تاب برداشت کرنے کے بعد انہیں کبھی پیچش کی شکایت

نہیں ہوئی لیکن بچپن میں انہیں اتنا شدید نزلہ و زکام ہوتا کہ اس پر قابو پانے کے لئے زکام کی دواء کے ساتھ بچپش روکنے کی دواء بھی دینا پڑتی اور کئی دنوں کے فاقے کے بعد کچھ افاقہ ہوتا۔ بچپن ہی سے جوانی کی خواہش رکھتے تھے جو اب تک جاری ہے۔ بڑھاپے سے صرف ایک قدم کے فاصلے پر ہیں لیکن پھر بھی اپنی جوانی سے صرف ایک چونی خرچ کی ہے اور باقی بارہ آنے شوکت عزیز کے اکاؤنٹ میں پڑے ہیں جو شاید اب اس کے ہاتھ لگ چکے ہیں۔ اس لئے آج یہ دونوں جوانی میں قدم رکھے بیٹھے ہیں اور جوانی میں ویسے بھی بڑا سوچ سمجھ کر قدم اٹھایا جاتا ہے۔ مثلاً ان میں اب بھی اس قدر پھرتی ہے کہ اگر ایک نوجوان اپنے ہاتھوں سے مکھی بھی اڑا نہ سکے یہ اسے منہ سے پکڑ کر دکھا دیتے ہیں۔ اپنے دور میں یہ کسی نہ کسی دعوتی محفل کا حصہ ضرور ہوتے تھے اور ان کی رعایا دے رہی ہوتی تھی: اپنے فاقوں کو دعوت.....

کیا ہنگامی سیاست اسی کا نام ہے؟ حال ہی میں کسی نے ان سے پوچھا کیا حال ہے؟ تو یوں محسوس ہوا جیسے کہہ رہے ہوں ٹھیک ''ٹھاہ..... ک'' ان کے پاس شروع ہی سے ضمیر نامی ''ڈرائیور'' ہے اور یہ اس سے کئی قسم کے کام لیتے رہتے ہیں۔ اگر اس کو روزمرہ کی ''گاڑی'' چلاتے ہوئے اونگھ آ جائے تو اس کو ایسی ملامت کرتے ہیں کہ بالآخر ضمیر جاگ جاتا ہے لیکن المیہ یہ ہے کہ اس سے مشورہ اس وقت کرتے ہیں جب سب کچھ کر چکے ہوتے ہیں۔ اگر لوگ ان سے کام یا سفارش کے لیے درخواست کرتے تو کہتے کہ میرا ضمیر نہیں مان رہا حالانکہ وہ بے چارہ ضمیر صرف ایک سگریٹ کی مار ہوا کرتا تھا۔ انہوں نے کبھی اس پر زائد بوجھ نہیں ڈالا اور نہ وہ کسی کام میں آڑے آتا ہے اب بھی، اگر وہ ضمیر، کبھی ان سے اختلاف رائے رکھے یا چالاکی کرے تو اسے کہتے ہیں کہ میں تجھے کھڑے کھڑے تو کیا بھاگتے ہوئے بھی بیچ سکتا ہوں، لیکن یہ بات مجھے کھاتی ہے کہ کہیں دنیا مجھ پر ضمیر فروشی کا الزام ہی نہ لگا دے ورنہ میں تم جیسے ضمیر کی ڈی۔ نیشنل لائزیشن کر کے شروع ہی سے اپنا باطن صاف کر لیتا۔ سقراط نے زہر کا پیالہ منہ کو لگاتے ہوئے کہا تھا کہ ایک تو یہ عدالت ہے جس نے مجھے موت کا پیالہ دیا لیکن ایک اور عدالت بھی ہے جسے ضمیر کی عدالت کہتے ہیں اور اس عدالت نے مجھے آج بری کر دیا اور تمام الزامات کو جھوٹا قرار دے دیا۔

☆.....☆.....☆

''طبعی'' مشورے

اگر کوئی بیماری نسخے کی بجائے نسخوں کی زد میں آ جائے تو سمجھ لیں یہ لاعلاج ہو چکی۔ ہر بیماری کا کوئی نہ کوئی نام ضرور ہوتا ہے لیکن شفا کا نام آج تک کسی ڈاکٹر نے نہیں رکھا، یہ بات ان تمام ڈاکٹروں کے لیے پریشانی کا باعث رہی ہے جو ڈاکٹر ہونے کے باوجود سیاست میں بھی قدم رکھتے ہیں اگر ہماری سیاست سے فراست نفاست اور حراست نکال دی جائے تو پیچھے سنگدلی، بزدلی یا دھاندلی رہ جاتی ہے۔ ہمارے ایک کہنہ مشق ڈاکٹر شیر مارخان کا شمار پاکستان کے ان قد آور سیاست دانوں میں ہوتا ہے جن کا سیاسی قد بعض اوقات ان کے بلڈ پریشر سے بھی بلند دکھائی دیتا ہے لیکن قسمت کے چکر بھی انسان کو بونا بنا دیتے ہیں۔ کئی لوگ زندہ رہنے کے لیے کھاتے ہیں اور کئی کھانے کے لیے زندہ رہتے ہیں مگر یہ ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جو سیاست کے لیے کھاتے ہیں اور کھانے کے لیے سیاست کرتے ہیں۔ اپنے نام سے کس کو چاہت نہیں ہوتی ان کے نام میں شیر کا جھپٹ آنا اس بات کا غمازی ہے کہ ان کے مزاج میں بھی شیر کا آنا جان لگا رہتا ہے لیکن کئی دفعہ اسے بھی ''باز'' آنے پر بھی مجبور کر دیتے ہیں۔ یہ بات بھی تجربے میں آئی ہے کہ کچھ لوگ غلطی سے اپنی شیروانی کی جیب میں وائرل زدہ گیدڑ سینگی رکھ لیتے ہیں جو بالآخر انہیں شیر کے منہ تک لے جاتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب بڑے اچھے شکاری ہیں لیکن ایک سیاسی مجبوری کے باعث شیر کے انتخابی نشان سے اتنا ہی دور بھاگتے ہیں جس قدر بھی ان میں قوت مدافعت ہو۔ کچھ عرصہ کے لیے میانوالی میں ایک کلینک بھی چلایا جو بعد میں کلنک کا ٹیکہ بھی ثابت ہوا لیکن ایک سیاسی مجبوری کی وجہ سے جس لفظ یا نام میں میاں آ جائے اس کو بھول کر بھی لب پر نہیں لاتے بلکہ اپنی نوکرانی کو بھی اس ''لفظ'' کے استعمال سے اجتناب کا مشورہ دیتے رہے ہیں۔ انہوں نے شاید ہی کبھی خامیاں، بدھ میاں اور سلامیاں جیسے الفاظ لب پر لائے ہوں۔ حالانکہ انہوں نے قدم قدم پر اپنے ڈرائیور کو انہی الفاظ سے نوازنا ہوتا ہے۔ اسلام آباد سے واپسی پر، میانوالی کی بجائے طنزاً یہ فرمائیں گے کہ میں میاں والا جا رہا ہوں تو ان کا ڈرائیور سمجھ جاتا ہے کہ یہ میانوالی کی بجائے کسی اور شہر کا ارادہ رکھتے ہیں اور اسی

عداوت کی وجہ سے یہ میانہ روی کی تلقین بھی نہیں کرتے۔ جتنا ان کا دل میانوالی میں لگتا ہے اتنا ہی ''میانوالی'' مسلم لیگ سے لگتا ہے۔ انہوں نے کئی عمرے کر رکھے ہیں لیکن کبھی اس کا برملا اظہار نہیں کرتے کہ میں نے حج کے علاوہ عمرہ بھی کیا ہوا ہے کیونکہ یہاں بھی ان کی سوچ، سیدھی جاتی عمرہ کو جاتی ہے۔ بحیثیت ڈاکٹر انہوں نے جتنی بھی پریکٹس کی ہے لیکن کبھی کسی مریض کے نمونیا، نزلہ اور نسیان کا علاج نہیں کیا کیونکہ ان کا آغاز بھی ''ن'' سے ہوتا ہے۔ یہ تو دور کی بات ہے انہوں نے اپنے کسی مریض کے لیے وہ دواء بھی تجویز تک نہیں کی جس کا آغاز ''N'' سے ہوتا ہو۔ اس کے برعکس صرف ایک چیز ایسی ہے جسے یہ تا حال ملک کی صحت کے لیے مجرب تصور کرتے ہیں بلکہ اسے ہر سیاسی بیماری کا علاج گردانتے ہیں اور وہ ہے این۔ آر۔ او جیسے یہ این آر او نہ ہوا، کوئی، او۔ آر۔ ایس ہوا۔ دوسری جانب انہیں اس لاگت بازی کی وجہ سے ایک غیر سیاسی فائدہ ضرور ہوا کہ انہوں نے وقت سے پہلے ''نسواں'' ضرور چھوڑ دی ہے۔ شیر مار خان بلاشبہ ان چند ڈاکٹروں میں سے ہیں جو اپنے ہی پولی کلینک سے Politics کا شکار ہوئے۔ چنانچہ سیاست میں بھی ڈاکٹری ''نسخوں'' کا فائدہ اٹھاتے رہتے ہیں جیسا کہ کسی زمانے میں اپنے پیشے ڈاکٹری میں سیاسی جوہر دکھایا کرتے تھے۔ یہ ہسپتال اور الیکشن سے یکساں لگاؤ رکھتے ہیں کیونکہ دونوں امور کے لیے کارڈ، وارڈ اور ریکارڈ بنانا پڑتے ہیں۔ اگر کسی دن کلینک میں مریضوں کا ''پولنگ ریٹ'' کم ہوتا تو بہت ناگواری محسوس کرتے تھے۔ بھلا بیماریاں کہاں ختم ہوتی ہیں جس طرح ان بیماریوں کے دادے پردادے اپنا کام جاری رکھے ہوئے ہیں اس طرح دوائیوں کے پوتے پڑپوتے بھی مریض سے زیادہ میڈیسن کمپنیوں کے آلہء کار ثابت ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر کا کام بیماری ختم کرنا ہوتا ہے نہ کہ بندہ اور اچھے سیاستدان ریاستی بھگدڑ اور سیاسی بھگی بلی کا علاج ایک دوا سے نہیں کرتے۔ مریض، مفکر اور مقدمے والے شخص کی جیب ''صحت'' سے ویسے بھی خالی ہوتی ہے اور اس کا اندازہ ہر ''پڑھے لکھے'' ڈاکٹر کو ضرور ہوتا ہے۔ دوران معائنہ، جب کبھی ان صاحب کا موڈ خراب ہوتا تو مریض کی نبض دیکھنے سے پہلے اس کی ''پسلی'' پر نظر بھی ڈال لیتے تھے اور اگر ''حلقے'' کا کوئی مریض مفت علاج کے لیے اصرار کرتا ہو تو اسے صاف کہہ دیتے کہ بھائی میری اتنی پسلی نہیں۔

☆.....☆.....☆

ایک اور جملہ.....!

یہ عالمی سچائی ہے کہ زبان تلوار سے بھی گہرا گھاؤ لگاتی ہے۔ بھلے تلوار کی جگہ نئے نئے ہتھیار موجود ہیں لیکن کیا زبان اپنی جدت میں کبھی کسی سے پیچھے رہی ہے؟ اور اس کا گھاؤ! آج بھی ہے، ہیلسینک میزائل کی مار سے گہرا۔ دوسری طرف خاموشی! تہام زبانوں میں سمجھی جاسکتی ہے اور کئی ''زبانیں'' ایسی ہوتی ہیں کہ ان کو لگام کی بجائے ''احترام'' دینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک مفکر کہتا ہے:

It has been well said, that heart speaks to heart, whereas language only speaks to the ears.

جناب والا! کانوں سے بولا تو نہیں جاسکتا لیکن کئی کان اپنا کام زبان سے بھی لے لیتے ہیں۔ زبان کو بتیس دانتوں کے قلعہ میں رکھ کر اسے کانوں کا محتاج بنا دیا گیا ہے لیکن پھر بھی اس کے اثرات کانوں کان ایک مخالف سے دوسرے تک پہنچ جاتے ہیں۔ اگر کان اونچا سنتے ہوں تو مخالف کی زبان کو بھی جواباً بہت اونچا نیچا ہونا پڑتا ہے۔ ویسے کئی لوگوں کی زبان گرجتے ہوئے نوے کا زاویہ بناتی ہے لیکن اس کے اثرات صفر درجہ تک رہتے ہیں۔ ہماری زبان اردو، جو انگلش میڈیم کے پھیلاؤ کی وجہ سے سمٹتی نظر آرہی ہے کو موجودہ زمانے میں ''دراز'' کرنے اور اسے حالات کے ریلیف کیمپ سے نکالنے کی فوری ضرورت ہے ورنہ اس کے لیے ''خدا بخشے'' کی صدائیں بھی بلند ہوسکتی ہیں کیونکہ دشمن اسے گدی سے نکالنے کی کوشش میں ہیں۔ یقینی طور پر اس میں ہمارے الیکٹرانک میڈیا کا ہاتھ بھی دکھائی دیتا ہے جو سارے کا سارا انگریزی میں ہے۔ ہمیں ان سب چیلنجز کا جواب بحیثیت قوم دینا ہے اور اپنی زبان کو، جو دنیا کے صرف ایک ہی ملک میں قومی زبان کے طور پر رائج ہے، جادو اں رکھنے میں کچھ کردار ادا کرنا ہے۔ اسے ''ٹالو'' سے لگنے سے بھی بچانا ہے ورنہ کہا جاتا ہے کہ ''زبان بدلنے سے کوچہ بدلنا بہتر ہوتا ہے'' قبل اس کے، ہمیں اپنی قومی زبان کی یاد میں انگریزی میں مرثیے لکھنا پڑیں، ہمیں اس زبان کی اتنی خدمت کرنا ہوگی کہ یہ دنیا میں بذات خود خنجر کی طرح فرفر چلتی ہوئی محسوس ہو اور اس ضمن میں ہمیں جتنی بھی ''زبان چلانا'' پڑے وہ کم ہے۔ ہم دنیا میں کہیں بھی ہوں لیکن ہمیں چاہئے کہ

ہم اپنی قومی زبان سے ''ہاتھ'' نہ کھینچیں اور اس بات کی بھی بالکل فکر نہ کریں کہ اس میں غیر ملکی زبانوں کے کتنے الفاظ شامل ہو رہے ہیں۔ انگریزی میں بھی سارے جہان کے الفاظ ہیں اور مزید ہو رہے ہیں اور اس کے تو اعداد بھی اپنے نہیں ہیں۔ زندگی کے بارے میں ویسے بھی کہا جاتا ہے کہ یہ غیر ملکی زبان کی طرح ہوتی ہے جس میں ہر ایک کا لہجہ دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ دنیا کی کسی بھی زبان کو طاقت کی فراہمی اس کا ادبی حلقہ دیتا ہے۔ جہاں انگریزی زبان کو شیکسپیئر، برنارڈ شا اور بنجمن وغیرہ نے توانائیاں بخشی ہیں وہاں انگریزی کے ایک غیر معروف لکھاری رچرڈ ٹیملٹن نے ایک چھوٹا سا یہ جملہ دیا تھا۔

A quick brown fox jumps over the lazy dog.

مندرجہ بالا Sentence یا جملے کی یہ خوبی ہے کہ اس میں انگریزی کے تمام حروف تہجی شامل ہیں جو انگریزی لکھنے، ٹائپنگ سیکھنے میں بہت مدد کرتے ہیں اور اس جملے کا استعمال بچہ بچہ کرتا ہے۔ انگریزی کے چھبیس Letters ہوتے ہیں جبکہ اس جملے میں صرف نو الفاظ خوبصورتی سے شامل کئے گئے ہیں۔ میری ایک خواہش تھی کہ اردو زبان کا بھی ایک ایسا جملہ ہو جس میں حروف تہجی کے تمام الفاظ شامل ہوں۔ چنانچہ میں نے اپنے دل کو تسلی دیتے ہوئے آج خود اس کام کا آغاز کیا چند گھنٹوں کے بعد بالآخر اس منزل کو پالیا اور اس کی ''چوٹی'' پر ایک ایسا جملہ ابھر کر سامنے آ گیا جس میں اردو کے تمام 37 حروف تہجی الف سے شروع ہو کر ''ے'' تک موجود تھے۔ انتیس الفاظ کی صورت میں جملہ آپ کی نذر ہے۔ ''ایک ٹیلے پر واقع مزار خواجہ فرید الدین گنج شکرؒ کے احاطہ صحن میں ذرا سی ژالہ باری چاندی کے ڈھیروں کی مثل بڑے غضب کا نظارہ دیتی ہے۔''

☆.....☆.....☆

کھرا سیاست دان

مسماۃ دھاندلی اور مسمی دھاندلا ہماری سیاست کا ایک اہم عروسی جوڑا ہے۔ انیس سو پچاسی کے الیکشن کے بعد سے اس جوڑے کی کئی نسلیں پروان چڑھ چکی ہیں اور اب تو ہر سیاسی موڑ پر اس کی اولاد کا کوئی نہ کوئی فرد گھیرا و چکر کرنے کھڑا محسوس ہوتا ہے اسی اولاد میں سے کچھ لوگ اب لیڈران کا روپ اختیار کر چکے ہیں ان لیڈران کی پالیسیوں پر اگر کوئی واہ! واہ! کرے تو اسے واہ ٹی میں پلاٹ کی آفر بھی ہو جاتی ہے اور اگر کوئی بدقسمت چوں چراں کرتا پایا جائے تو اسے اس کے بالکل ساتھ ''ٹیکس لا'' میں اندر بھی کیا جا سکتا ہے۔ اسی وجہ سے کچھ لوگ اپنی دل میں گلٹی محسوس کرتے ہوئے دل برداشتہ ہو کر سیاست کو خیر باد کہہ چکے ہیں لیکن ان میں سے ایک ایسا بلند قامت سیاست دان بھی ہے جو کہ ایک عرصے تک سیاست کے میدان ایک دوسرے بزرگ سیاست دان کی سورگ باشی کا کڑا انتظار کرتا رہا ہے لہٰذا اب موقع پاتے ہی اس نے سیاست کے میدان میں اس وقت اپنی خدمات پیش کرنے کی خواہش کا اظہار کیا ہے جب کہ بین الاقوامی طور پر ہمیں جمہوری مملکت تسلیم کرنے میں پس پشت سے کام لیا جا رہا ہے اور وہ ہے کھرا سیاست دان صاحب! پچھلے دنوں انہوں نے خود کو دوبارہ سیاست میں ''ملوث'' کرتے ہی ایک نہایت دلچسپ انٹرویو دیا جس میں انہوں نے دوٹوک انداز میں فوج کے سیاست میں دس سالہ شرکت اقتدار پر زور دیا لیکن انہوں نے یہ واضع نہیں کیا کہ اس شرکت اقتدار میں وہ کس طرف سے شریک ہوں گے۔ انہوں نے اپنی ''انفرادی'' کمیشن رپورٹ عوام کے سامنے لاتے ہوئے کئی باتوں سے پردہ چاک کیا ہے ان کے انٹرویو سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ ان کیلئے آٹھ اور تیرہ کا ہندسہ نہایت اہمیت کا حامل رہا ہے ان کے بقول انہوں نے تیرہ سال کی عمر میں پہلا عشق اپنی استانی سے کیا اور دوسرا چھبیس سال کی عمر میں اپنی ''شاگرد'' سے تیسرا عشق انتالیس سال کی عمر میں کرنے کے بعد انہیں اس ''کام'' میں مکمل عبور حاصل ہو گیا اور پھر انہوں نے آٹھویں شادی کی تکمیل تک اسے مسلسل اپنا شعار بنائے رکھا ہے آٹھویں شادی شاید کسی وجہ سے انہیں راس نہیں آئی ہے کیونکہ اس کے بعد سے وہ مسلسل ''کنوارے'' چلے

آ رہے ہیں میرے خیال میں انہیں آٹھویں شادی سب سے پہلے کر لینا چاہئے تھی تاکہ زحل کی نحوست کا سایہ ان پر نہ پڑتا ساتھ ہی انہوں نے یہ خواہش بھی ظاہر کی ہے کہ فی الحال اب ان کا شادی کا کوئی ارادہ نہیں تاحال انہیں کوئی ضرورت مند "سخی" اس امر پر مجبور نہ کردے ویسے بھی پنجاب کا کوئی ایسا معروف شادی ہال نہیں جہاں ان کے جوتے چھپانے یا دودھ پلانے کی رسم ادا نہ کی گئی ہو باقی سیاست دان گھاٹ گھاٹ کا پانی پینے میں مشہور ہیں لیکن موصوف تو گھاٹ گھاٹ کا دودھ بھی پی چکے ہیں زیادہ شادیوں کے خواہش مند حضرات کیلئے یہ بات سودمند ہے کہ وہ نکاح خوانی اور "دایہ بانی" کا شارٹ کورس کر کے اس میں خود ہی مہارت حاصل کر لے ورنہ بقول عطاالحق قاسمی ۔

صحرا کو نکل جائیں تو دل بھی ذرا بہلے
شہروں میں تو ہنگامہ تنہائی بہت ہے

پنجاب بینک کا انٹارریز و کمیٹیل بھی نہیں ہوگا جتنا ان کے سر پر حق مہر کا بوجھ ہے ویسے اسلام میں چار شادیوں کی باامر مجبوری اجازت تو ہے لیکن ہوسکتا ہے انہوں نے ایک عورت سے آدھی شادی کا اہل پاس کروایا ہو اور چار سے آٹھ بنالی ہوں ۔ زیادہ شادیوں کے متعلق وجوہات بیان کرتے ہوئے انہوں نے واضح کیا کہ وہ خاصے حسن پرست واقع ہوئے ہیں کچھ اسی لئے وہ جانوروں سے بھی بہت محبت کرتے ہیں اور شاید اسی لئے انہوں نے کئی سیاسی گینڈے اور مگرمچھ بھی برداشت کئے ہوئے ہیں انہوں نے کئی مور اور مینڈھے بھی پال رکھے ہونگے اسی لئے ان کی سابقہ بیوی نے اپنی کتاب "مینڈھا۔ سائیں" میں اپنی قلم کی جولانیاں دکھائی ہیں جس میں ان کے بھارت میں ایک لمبا عرصہ گزارنے کی وجوہات بھی درج ہیں ۔

برطانیہ کے وزیراعظم چرچل نے دو انگلیاں کھڑی کر کے وکٹری کا نشان ایجاد کیا تھا جس کا سیاسی قائدین اب بھی استفادہ حاصل کرتے رہتے ہیں لیکن ہمارے کئی سیاست دان عمر کے اس حصے میں پہنچ چکے ہیں جو "کمزوری" کی وجہ سے وکٹری کا نشان بھی نہیں بنا سکتے ۔

انگلستان کے بادشاہ ہنری ہشتم کو شادیاں کرنے کا شوق تھا لیکن وہ جس ملکہ سے اکتا جاتا اس کا سر قلم کروا دیتا ملکہ جین کی موت کے بعد ہنری ہشتم کو شادی میں دشواری پیش آ رہی تھی بالآخر اس نے میلان کی شہزادی کو شادی کا پیغام بھیجا۔ شہزادی کو اپنے انجام کی بھرپور خبر تھی اس نے یوں جواب دیا افسوس کہ میرا ایک ہی سر ہے اگر دو ہوتے تو ایک سر آپ کی خدمت میں پیش کر دیتی۔ بقول ایک مضروب بیوی کے گھر بسانا اور گھر بسانا دونوں بہت مشکل ہیں کیونکہ

Might is right when wife is right

یہ بات باعث اطمینان ہے کہ ہمیں کھر کی صورت میں ایک ''کھرا'' سیاست نواز مل گیا ہے کھر صاحب کا تعلق ملتان کے مضافاتی علاقے مظفر گڑھ سے ہے ملتان ویسے بھی گرد، گرما، گدا گر اور گورستان کی اصطلاح میں مشہور ہے لازمی بات ہے جہاں اتنی گرمی پڑے گی وہاں کے قبرستان یقیناً وسعتیں اختیار کریں گے۔ گرد و خاک کا باعث یقیناً گرد یزی اور خاکوانی ہی ہو سکتے ہیں اور جہاں یہ دونوں خاندان بستے ہوں وہاں ان کے مقابلے میں باقی سب ''گدا گر'' ہی نظر آئیں گے ملتان کی گرمی کا یہ عالم ہے کہ وہاں کے لوگ اگر گاڑی کے ریڈی ایٹر سے پانی نکال کر پی لیں تو پھر بھی ان کے گلے پڑ سکتے ہیں اور کوئی ٹانسلز کا مریض گاڑی والے کے گلے پڑ سکتا ہے کیونکہ اس نے مریض کو اتنا ''ٹھنڈا'' پانی پلا کر ثواب کی سعادت حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہاں کی زبان سرائیکی اپنی مٹھاس میں ویسے ہی بہت مشہور ہے اس لئے کھر صاحب کے اردگرد بہت سی ''مکھیاں'' بھنبھناتی نظر آتی ہیں خصوصاً جب یہ کوئی زوردار تقریر کریں تو۔

کھر صاحب اس دفعہ الیکشن لڑنے سے قاصر رہے تھے کیونکہ اس کیلئے بی اے کی شرط تھی حالانکہ ہمارے اسلاف میں شرط کی ممانعت ہے لیکن مضحکہ خیزی اس وقت سامنے آئی جب کھر صاحب کے حلقے سے کامیاب ہونے والے ایم این اے کے بارے میں یہ خبر تھی کہ ان کی ڈگری پر کھر صاحب کے دستخط ثبت ہیں کیونکہ وہ اس وقت یونیورسٹی کے چانسلر تھے کئی سیاست دان کھر صاحب پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ وہ ایجنسیوں کے آدمی ہیں حالانکہ وہ یہ بھولے ہوئے ہیں کہ آٹھ سے زائد بیویوں کے آدمی کے پاس اتنا وقت کہاں؟

دریں اثناء کچھ سیاست دانوں نے کھر صاحب کو چلا ہوا کارتوس قرار دے دیا ہے۔ 1857ء کی جنگ آزادی ہارنے کی وجہ ایک یہ بھی تھی کہ انگریزوں نے ''ہمارے'' کارتوسوں پر گائے اور سور کی چربی کی افواہ چھوڑ دی تھی ان کارتوسوں کو استعمال سے پہلے منہ سے چھیلنا پڑتا تھا۔ ہندو اور مسلمان ان کارتوسوں کو استعمال کرنے سے قاصر رہے تھے اور بلآخر اسی وجہ سے انگریزوں کے نرغے میں آ گئے ازراہ ہمدردی کئی کانیاں سیاست دان یہ بھی کہتے ہیں کہ اس کارتوس سے تو ابھی تک پیکنگ بھی نہیں اتری اس کا چلنا اور نہ چلنا تو ابھی دور کی بات ہے بہرحال حاجی غلام محمد مصطفےٰ کھر کا سیاست میں آنا بادِ نسیم کا ایک fresh جھونکا ہے جس سے کئی نازک اندام سیاست دانوں کو ''زکام'' کا خدشہ بھی ہو سکتا ہے۔

☆.....☆.....☆

''پچکے گال''

ہمیں جتنے لوگ موٹے نظر آتے ہیں، ان میں بعض لوگ اتنے کمزور ہوتے ہیں کہ انہیں تیز ہوا آندھی وغیرہ سے بچنے کیلئے ہاتھ میں سگریٹ پکڑنا پڑتا ہے اور اگر جسم کے کمزور ہونے کے ساتھ ساتھ شخصیت بھی کمزور ہو تو کیا کہنے۔۔۔ یہ سو پاؤنڈ کے ہلکے لوگ بظاہر کمزور اور ناتواں نظر آتے ہیں، لیکن اپنے تمام کاموں کے حصول میں سو فیصد کھرے ہوتے ہیں اور اس سے ہر مونا کام لے کر رہتے ہیں، حالانکہ یہ لوگ ایک روٹی کا ایک نوالہ بنا لیتے ہیں لیکن پھر بھی ان کے جسم پر گوشت ''پوست'' کم ہوتا ہے، شاید اسی وجہ سے خود کو پوستی سا محسوس کرتے ہیں۔

میرا دوست سلیم ''سلم'' کہتا ہے کہ جب کبھی ہم جیسے Slim لوگ آئینہ دیکھتے ہیں تو اس میں اپنے پچکے ہوئے گال دیکھ کر اپنے ہی گالوں پر مور کے آنسو بہاتے ہیں، جیسا کہ مور اپنے پاؤں کو دیکھ کر مگرمچھ کے آنسو بہایا کرتا ہے۔ بظاہر کمزور نظر آنے والے ان لوگوں کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ اپنے ان پچکے ہوئے گالوں کو باہر نکال کر اپنی ہتھیلیوں پر رکھ لیں۔ یہ لوگ اپنی اندر دھنسی ہوئی آنکھوں کے بارے میں اتنا پریشان و بے قرار نہیں ہوتے، جتنا وہ اپنے اندر دھنسے ہوئے گالوں کے بارے میں ہوتے ہیں.....

چنانچہ یہ فوجی کٹ رخسار لوگ اپنے منہ کو موٹا تازہ بنانے کیلئے عطائیوں کی دوائیوں سے جسم کو فربہ بنانے کی ''منہ توڑ'' کوششیں کرنا شروع کرتے ہیں، حالانکہ کئی جگہ تر و تازہ نظر آنے کیلئے کمزور اور پھرتیلا جسم زیادہ اہم کردار ادا کرتا ہے اور اگر یہ کردار فلمی اور مزاحیہ ہو تو پھر اور کیا کہنے.....

ہماری اردو میں نجانے کیوں موٹے کے ساتھ تازہ کا لفظ استعمال ہوتا ہے، جیسا کہ شاعر کے ساتھ مشہور کے لفظ جوڑ کر اس کی وقتی پذیرائی کی جاتی ہے۔ نتیجتاً یہ پچکے گال لوگ مونا اور Bulky ہونے کی خاطر جعلی دوائیوں کے استعمال سے اناج کا استعمال بھی برائلر مرغیوں کی طرح کرتے ہیں۔ اس طرح ان کی ہر روز کی بجائے ہر لمحے عید ہوتی ہے۔ کھاتے کھاتے یہ ڈکار بھی اپنی جیب میں مار کر اس کا فائدہ اٹھانے سے گریز نہیں کرتے، اگر وہ کسی وجہ سے ایسا نہ

کر سکیں تو بھی انہیں کمزوری محسوس ہوتی ہے.....

ایک فارسی کہاوت ہے کہ

''فربہی چیزے دگر آماس چیزے دیگر است'' یعنی موٹاپا اور چیز ہے اور سوجن کوئی اور شے۔ اوٹنی چیز اور ہوتی ہے، اعلیٰ شتے اور۔ لیکن ان پر کسی بات کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اگر کوئی شخص ان گال گڑھوں کو جعلی دوائیوں سے منع کرنے کی نصیحت کرے تو ناصح کو اس کی نصیحت بھی ان کی گالوں کے گڑھے میں بے یار و مددگار پڑی ملا کرتی ہے.....

اس کے برعکس دوسری طرف وہ موٹے لوگ ہیں، جن کے معدے کے سوا جسم کا ہر اعضا، بے کار محسوس ہوتا ہے۔ ان کے موٹاپے کی وجہ سے ان کے ہر قسم کے اخراجات بھی پیٹ کی طرح بڑھے ہوتے ہیں۔ مثلاً اگر کوئی پتلا شخص ایک تکیہ صابن سے تیرہ چودہ دفعہ نہاتا ہے تو یہ اس تکیہ کا استعمال تین چار مرتبہ ہی کر پاتے ہیں۔ اپنے سوٹ کے کپڑے کیلئے انہیں میٹروں کی بجائے ''گانوں'' میں سودے بازی کرنا پڑتی ہے اور تنبو کناتوں والوں سے سِلا کر کئی قسم کی قناتیں کرنا پڑتی ہیں۔ موٹاپے کا تو خرچہ ہی خرچہ ہے، جو ان کی گردن کی طرح کبھی پیچھے مڑ نہیں سکتا۔

ان بھیم شکیم لوگوں کو اپنی خوراک کا خرچہ بھی مہابھارت کو درپیش مسائل کی طرح برداشت کرنا پڑتا ہے، ان کے ''موٹا Paw'' پاؤں کیلئے جوتا تلاش کرنے والا خود اپنے پُر رخسار اور پُر گوشت گالوں سے ''ہاتھ دھو'' بیٹھتا ہے، اگر یہ کھڑے ہوں تو پیٹ کے پھیلاؤ کی وجہ سے اپنے قیمتی اور نایاب بوٹ دیکھنے کے شوق سے بھی محروم رہتے ہیں، حالانکہ یہ بوٹ ان کے پاؤں پڑے سسکیاں لے رہے ہوتے ہیں اور تو اور انہیں ان بوٹوں کیلئے بڑی بڑی جرابوں کی جگہ آٹے کا خالی تھیلا استعمال کرنے کا مشورہ بھی دینا پڑتا ہے..... پھر ان کے لب زبان پر شعر آتا ہے:

زندگی تو نے مجھے قبر سے کم کر دی ہے جگہ
پاؤں پھیلاؤں تو دیوار سے سر لگتا ہے

میرے ایک ملنے والے مولانا متعصب صاحب بھی بہت بھاری بھرکم جسیم ہیں، اس لئے وہ صرف اخبارات کی ''موٹی موٹی'' سرخیاں ہی پڑھتے ہیں۔ انہوں نے بھی ایک ہیلتھ کلب جائن کیا ہوا ہے، حالانکہ انہیں کسی ''Hell'' کلب میں سینک لینا چاہئے۔

وزن تو آخر وزن ہی ہوتا ہے اور اس سلسلے میں ان پر بڑا ''فضل الرحمٰن'' ہے، اس لئے

کچھ لوگ وزیراعظم جناب ظفراللہ جمالی کو یہ مشورہ دینے کی گردن توڑ کوشش کر رہے ہیں کہ وہ اپنی کرسی پر اپنا کم سے کم بوجھ ڈالیں اور اپنا آدھا وزن اپنے بوٹوں پر بھی رکھیں، کیونکہ ہمارے ہاں منتخب وزیراعظم کو فرائض منصبی کی ادائیگی کیلئے ہمیشہ کاٹھ کی کمزوری کرسی ہی دی جاتی ہے.....

آج کل کے زمانے کے کچھ فربہ لوگ جن کو ہر چند باریک کام کرنے کا شوق بیدار ہونا شروع ہوتا ہے اور وہ سلمنگ سنٹر کا رخ کرتے ہیں۔ جن کے موٹاپے کی وجہ سے قرض وصولی کے سمن نکل چکے ہوں، وہ سڑکوں پر سیر و سفر کے دوران اپنے گمشدہ پچکے گال تلاش کرتا ہوا سرگرداں نظر آتا ہے، یعنی موٹاپا سیر سپاٹا کرتا ہوا پایا جاتا ہے..... آج کل ڈائٹنگ کا زمانہ شروع ہے، بلکہ یہ ایک فیشن بن چکا ہے۔ نوجوانوں اور خصوصاً عورتوں میں اس کا رواج بہت مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔ جابجا جاگنگ، جم اور ادویات کا کثرت سے استعمال ہو رہا ہے۔ لوگ پارکوں اور سڑکوں پر اپنے موٹاپے کو دریابرد کرتے پائے جا رہے ہیں یا اپنا وزن کمزوری کے حوالے کرنے کی کوشش میں سرگرداں ہیں.....

انسان اور ملک کسی حال میں بھی خوش نہیں رہتے۔ ڈائٹنگ اور سلمنگ کا یہ رواج اب ملکوں نے بھی اپنانا شروع کر دیا ہے۔ بڑے بڑے ملک اب اس فیشن میں شامل ہو رہے ہیں اور اپنا فربا جسم میدان جنگ میں Exercise سے کم کرنے کے رواج کو تقویت بخشنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ خصوصاً وہ ملک جو مسلمانوں کے دشمن ہیں، ان میں تو ڈائٹنگ کا رواج بہت ہی جڑ پکڑ چکا ہے، مثلاً روس ایک بہت بڑا ملک تھا، کچھ عرصہ پہلے اپنے جسم کی ڈاؤن سائزنگ کر کے اس رواج کی بنیاد ڈالی۔ اس نے افغانستان پر حملہ کر کے اپنی ایکسر سائز شروع کی اور پھر رفتہ رفتہ آپ نے دیکھا کہ اس کی ساخت کم ہونا شروع ہوگئی۔ دریں اثناء روس ایک سمارٹ اور خوبصورت ملک بن گیا۔ اب امریکہ اس فیشن کے چربے میں مصروف ہے۔

☆.....☆.....☆

اقوالِ شیریں

☆ **انسان مزید، مفید اور جدید کے چکروں سے کبھی باہر نہیں نکلتا۔**

☆ **خاموشی تمام زبانوں میں سمجھی جا سکتی ہے۔**

☆ **جو پرندہ کسی کے سامنے پر نہیں مار سکتا یہ اس کے بھی پر کُتر لیتے ہیں۔**

☆ **پرویز مشرف کے پاس کوئی گیدڑ سینگی تھی جس کی وجہ سے وہ شیر بننے کی کوشش کرتے رہے۔**

☆ **''وہ'' کسی کے افسوس پر جانے کیلئے بصد خوشی تیار ہو جاتے ہیں۔**

☆ **اگر انسان صرف تراش خراش کا ماہر ہو تو وہ انسانی تہذیب کا ڈیزائن بدل سکتا ہے۔**

☆ **پوری دنیا کے لوگ اپنا غبار نکالنے کیلئے تقریر، تحریر یا تصویر کا سہارا لیتے ہیں۔**

☆ **ایک وقت تھا جب ادارہ قومی بچت کی بچت کے امکانات معدوم ہو گئے تھے۔**

☆ **بچپن میں ایک بھینس ان کی ملکیت تھی پھر بھی اس کے ''Milk'' سے فائدہ نہ اٹھا سکے۔**

☆ **عالمی منظر نامے میں ایک اداکارہ کیلئے نکاح، نقائص میں شمار ہوتا ہے۔**

☆ **ہمارے ہاں کسی جھگڑے کی افزائش کیلئے مواد، موسم یا محل وقوع درکار نہیں ہوتا۔**

☆ **تالی دو ہاتھ سے بجتی ہے اگر ایک ہاتھ سے بج رہی ہو تو سمجھ لیں کوئی خفیہ ہاتھ کارفرما ہے۔**

☆ **بھول جانے کی عادت عورتوں میں زیادہ ہوتی ہے اور مردوں میں یاد رکھنے کی کم، اس لئے دونوں ہی اس بیماری کا شکار پائے گئے ہیں۔**

☆ **''ہماری پارٹی کا اصولی موقف ہے کہ اگر کسی غریب کے پاس رہنے کو گھر نہیں تو اسے اپنے دائرے میں رہنا چاہئے یا قانون کے۔''**

☆ **ہو جس کے ہاتھ میں ڈنڈا مت کہیو اس سے پنگا۔**

☆ **حالانکہ لکھے پڑھے تھے مگر خزاں اور خزانے کے لفظی فرق سے ناآشنا تھے۔ محفل کو مئے فل**

لکھا کرتے تھے اور چوراہا کو چوراہا پڑھا کرتے تھے انہیں والد کے ہاتھوں اتنی مار نہیں پڑی جتنی انگریزی کے ہاتھوں۔

☆ کئی حکمران اتنے سیاستدان بن جاتے ہیں کہ انٹرویو کیلئے تین تردیدوں کی گنجائش بھی حاصل کر لیتے ہیں۔

☆ لڑائی کے بارے میں میرا موقف بڑا اصولی اور واضح ہے کہ کوئی میرے ساتھ جھگڑا کرے تو میں اسے غنڈہ گردی قرار دیتا ہوں اور اگر میں خود کسی کے ساتھ الجھ جاؤں تو یہ میری جواں مردی ہے۔

☆ بچوں کی ہاتھا پائی کی وجہ سے لڑنے والے والدین بھی بچے ہی ہوتے ہیں، بھلے ان کے دانت لڑائی کی بجائے عمر رسیدگی کی وجہ سے گر چکے ہوں۔

☆ قصاب سے ہر اعضاء کی قیمت پہلے طے کر لینا چاہئے ورنہ بعد میں بہت قیمت چکانا پڑتی ہے۔

☆ بڑے لوگ اپنے لئے بڑی بڑی خواب گاہیں تعمیر کرنے کیلئے بڑی جدوجہد کرتے ہیں لیکن انہیں اپنی نیند سونے کیلئے اس سے بھی زیادہ جدوجہد کرنا پڑتی ہے۔

☆ تنہائی شاعری کیلئے دواء اور اداکاری کیلئے سزا ثابت ہوتی ہے۔

☆ خدا جھوٹ نہ بلائے اگر آپ واقعی سفید جھوٹ کو مجسم حالت میں چاہتے ہیں تو کسی امریکی سیکرٹری کو دیکھ لیں۔

☆ چوروں سے چھٹکارا آسان مگر کام چوروں سے مشکل ہوتا ہے۔

☆ دانت جسم کا اہم عضو ہیں۔ دانتوں سے ڈسنے، ڈرانے اور ڈکارنے کا کام لیا جاتا ہے۔

☆ جتنی دیر میں ہماری ہیروئن تیار ہوتی ہے اتنی دیر میں ایک دیگ تیار ہو جاتی ہے لیکن پھر بھی ہیروئن کو میک اپ کے ''دم'' میں ایک دم رکھنا ضروری ہوتا ہے۔

☆ وہ اتنا اصولی ہے کہ ڈنر سیٹ میں کبھی لنچ نہیں کرتا۔

☆ ان کی بدہضمی کا یہ حال ہے کہ ذرا بڑا ڈکار بھی انہیں ہضم نہیں ہوتا اور اگر دو سگریٹ اکٹھے پی لیں تو چہل قدمی کرنا پڑتی ہے۔

☆ جھگڑا چھوٹے لوگ شروع کرتے ہیں اور راضی نامے کے لیے بڑے میداں مارتے ہیں۔

☆ خواب، عقاب اور آفتاب کو کھلی آنکھ سے نہیں دیکھنا چاہئے۔

☆ سگریٹ ایک ایسی چیز ہے جس میں ''گش'' اور ''گش'' دونوں ممکن ہیں۔

☆ جھوٹ غلطی سے ان کے منہ سے نکلتا ہے یعنی انہوں نے آج تک لفظ جھوٹ غلط نہیں بولا اور اس میں کبھی گرائمر کی غلطی بھی نہیں کی۔

☆ اگر کوئی بیماری نسخے کی بجائے نسخوں کی زد میں آ جائے تو سمجھ لیں لاعلاج ہو چکی۔

☆ ہمارے ہاں غریبوں کا ہر دن بھاری، شام خواری اور رات اندھیاری ہوا کرتی ہے۔

☆ سیاست ایک ایسا آرٹ ہے جس میں سانپ اور نیولے کا ''عارضی معاہدہ'' کرایا جا سکتا ہے۔

☆ جب یہ انگریزی لہجے میں اردو بولے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ لفظ شیطان ''She طان'' اور بھجوا کو ''HE جوا'' کہہ کر جنس بدل رہا ہے۔

☆ سیاسی شعبے میں لیاقت، ظرافت اور نقابت کا بہت فائدہ ہوتا ہے۔

☆ غیر حاضر ہونے کے باوجود حاضر دماغ خوالدار لائن حاضر ہونے سے بچ گیا۔

☆ شاگرد فوری حکم بجالاتے ہوئے باجا لے آیا۔

☆ جھوٹ کی تین قسمیں منظر عام پر آ چکی ہیں، قائل کرنے والا، مائل کرنے والا اور مسائل پیدا کرنے والا۔

☆ شاعر بذات خود کسی بھی معاشرے کا اہم ''رکن'' ہوتا ہے وہ اپنے منظوم پیغام کے ذریعے کسی بھی معاشرے، مشاعرے اور محفل لے کے تکسرے ہلا سکتا ہے۔

☆ بیوی، Boss اور استاد کا ہمیشہ خیال رکھیں۔

☆ گرفتاری بھی طرح کی ہوتی ہے محبت میں گرفتار مسائل میں گرفتار اور مجرمانہ فعل میں گرفتار۔

☆ نتائج کی ایک کمزوری یہ ہوتی ہے کہ وہ فریاد کرتا ہے فرمائش نہیں۔

☆ بس ''ہاں'' اور ''نہیں'' سے نہایت جامع جھوٹ بولا جا سکتا ہے۔

☆ وہ اتنا صفائی پسند نہیں لیکن جھوٹ پوری صفائی سے بولتا ہے۔

☆ اگر گھر میں رہائش موجود نہ ہو تو تالا ضرور وجود ہوتا ہے اور اگر یہ گھر کے باہر نظر نہ آئے تو اندر چور ضرور ہوتا ہے جو گھر کا پرانا تالا بھی نہیں چھوڑتا۔

☆ باز کے ساتھ پرواز کرنے والوں کو بٹیروں کی صحبت سے ''باز'' رہنا چاہئے۔

☆ اگر عورت کوئی بات بھولے تو اسے ''فراموShe'' کہتے ہیں اور اگر مرد بھولے تو ''Heلا باز''۔

☆ خواہش اور لالچ کے بیچ جھلی کو حسد کہتے ہیں۔

ایک جملہ.....

ایک ٹیلے پر واقع مزار خواجہ فرید الدین گنج شکرؒ کے احاطۂ صحن میں ذرا سی ژالہ باری چاندی کے ڈھیروں کی مثل بڑے غضب کا نظارہ دیتی ہے۔

(اس جملے میں اُردو حروفِ تہجی کے تمام حروف موجود ہیں)

نابینا شخص چھوٹی چھوٹی چیزوں کو اپنی بصیرت کے سبب دیکھ لیتا ہے اور اگر بینا شخص اپنی بصیرت کھو بیٹھے تو سمجھئے پورا کا پورا نابینا ہو چکا۔

☆.....☆.....☆

ہم عہد یوسفی میں زندہ ہیں اور یہ عہد طنز و مزاح کا سنہری دور ہے۔ اس دور میں مزاح نگاروں اور مزاح گو شعرا کی ایک بڑی تعداد سامنے آئی اور ایسے ایسے نادر مضامین اور اشعار تراشے کہ فن شگفتہ و ظرافت لکھاری پر رشک کرے گا۔ جو لوگ طنز و مزاح کے نام سے بدکتے تھے اب وہ بھی کوشاں نظر آتے ہیں کہ مزاح نگار بن جائیں مگر یہ صنف اتنی آسان بھی نہیں کہ کوئی راتوں رات مزاح نگار یا مزاح گو شاعر بن جائے اس کے لیے علم چاہیے مطالعہ اور مشاہدہ چاہیے۔ اس کے لیے حسِ مزاح کا ہونا بھی لازمی ہے کئی لوگ اس مشکل ترین فن میں شامل ہوئے مگر بھاری پتھر سمجھ کر چھوڑ گئے۔ ہر لکھاری مشاق احمد یوسفی، کرنل محمد خاں، ڈاکٹر شفیق الرحمٰن، عطاء الحق قاسمی، ڈاکٹر یونس بٹ، انور مسعود، سید ضمیر جعفری، دلاور فگار، سرفراز شاہد نہ بن سکا۔

علی رضا احمد ابھی نوجوان ہیں مگر ان کے مجموعوں پر مجموعے شائع ہو رہے ہیں وہ اتنی تیز رفتاری سے سامنے آئے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے ان کی تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ یہ شخص لکھنا جانتا ہے۔ کسی عنوان پر وہ لکھنے بیٹھتے ہیں تو لکھتے ہی چلے جاتے ہیں جیسے کہ قلم کہیں بھی رکنے کو تیار نہیں ان کے دو مجموعے (دھنی آں) اور (ایرے غیرے) میرے زیر مطالعہ ہیں جہاں تک پڑھ چکا ہوں دلچسپی میں کوئی کمی نظر نہیں آئی

علی رضا احمد کے سامنے ایک وسیع میدان پڑا ہے ان کی شائع شدہ تحریریں پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک اچھے مزاح نگار بن چکے ہیں۔

اللہ کرے زور قلم اور زیادہ

الحمد